جلد ۱۲۴ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۷۹ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آہ مولانا عبدالسلام قدوائی!

آنکھیں اشکبار ہیں، دل اندوہ وغم کا جوئبار ہے جب یہ قلم فگار ہو کر لکھ رہا ہے کہ مولانا عبدالسلام قدوائی جو دارالمصنفین کی علمی اور نجی مجلسوں کی رونق، عزت اور آبرو تھے، ہم سب کو چھوڑ کر یکایک آغوشِ رحمت الٰہی میں چلے گئے،

.....⁂.....

وہ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اُس وقت آئے جب جناب شاہ معینُ الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی رحلت سے یہاں کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا سوگوار اور بے رونق ہو رہا تھا، وہ یہاں آئے تو اپنے جلو میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی بے پناہ عظمت، اپنے اُستاد مولانا سید سُلیمان ندوی کی غیر معمولی عقیدت، جناب شاہ معینُ الدّین احمد ندوی مرحوم کی شخصیت سے اپنی مخلصانہ محبت اور خود اپنی ذات کی لینت، مروت اور ملاطفت کا لشکر ساتھ لائے، اور اس راقم سے ایسے گھل مل گئے کہ ہم دونوں کے درمیان شیر و شہد کی کو ثبتی نظر آنے لگی، اُن کی آمد سے دارالمصنفین کی سرگرمیوں میں شادابی، اُس کی امیدوں کے پھولوں میں رعنائی اور اس کی تمناؤں کے مرغزاروں میں دل فریبی پیدا ہونے لگی، مگر معلوم نہیں مصلحتِ خداوندی کیا تھی کہ دارالمصنفین کے

رفقا، اُن کی علمی بصیرت، اور بزرگانہ الفت سے ہر طرح کا استفادہ کر رہے تھے، کہ وہ اچانک دائمی طور پر اُن سے جدا ہو گئے، وہ ۲۷ رمضان المبارک کو تراویح پڑھ کر اور تہجد اور فجر کی نماز ادا کر کے چار بجے صبح اعظم گڈھ سے اپنے وطن تھلینڈی ضلع رائے بریلی عید منانے روانہ ہوئے، وہاں پہنچنے کے دوسرے روز سحری کے وقت اٹھے، یکایک بیہوش ہوئے اور جمعہ کے روز گیارہ بجے دن کو اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے دن عید کی نماز کے بعد اُن کی طالب علمی کے محبوب اور شفیق ترین ساتھی اور اسلامی ممالک کے فاضل اجل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اُن کے ساتھ سوگوار بیٹوں اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور وہیں گوناگوں خوبیوں کا یہ مجسمہ سپردِ خاک کر دیا گیا،

.....⁂.....

اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۰۶ء تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیلِ علوم کے بعد مزید تعلیم کے لئے جامعہ ملیہ دہلی گئے، وہاں سے بمبئی کے اُس زمانہ کے مشہور اخبار خلافت کی مجلسِ ادارت میں شریک ہو گئے، پھر ۱۹۳۲ء میں ندوہ میں مدرس کی حیثیت سے بلائے گئے، لکھنؤ میں ادارۂ تعلیماتِ اسلام قائم کیا، جہاں تعلیم یافتہ حضرات کو کلام مجید کا درس دیتے، اور آسان ریڈروں کے ذریعہ سے عربی سکھاتے، یہاں سے ایک جریدہ تعمیر بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ شائع کرتے رہے، پھر جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں اکیس ۲۱ سال تک اس درس گاہ کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرتے رہے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ندوہ کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے، پھر جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد مولانا ابوالحسن علی کی خواہش پر دارالمصنفین کی کشتی کے دیدبان بن کر آئے،

.....⁂.....

ان تینوں اداروں سے اُن کو عشق رہا، ندوہ اُن کی لیلیٰ تھی، جامعہ ملیہ اُن کی عذرا تھی، دارالمصنفین اُن کے لئے شیریں بنی ہوئی تھی، یہاں فرہاد بن کر اس کے لئے جوئے شیر نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی فکر کا تیشہ لئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی،

....۰....

اُن کی شخصیت ایک عطر مجموعہ تھی، وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست، بہت اچھے شاگرد، بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، اُن کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو اُن کے سویدائے دل کے اندر حسین اور شامہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری کی ڈلی چبا رہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں، جس کے ساتھ رہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب، ندوہ میں اُن کے ہم درس رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جو اُردو کی بے شمار تصانیف کے مشہور مصنف ہوئے، اُن سے بچھڑے ہوئے خدا جانے کتنی مدت گزر چکی تھی، مگر شاید ہی کوئی روز ایسا گذرتا، جب وہ اُن کی یادوں کی برات نہ سجاتے، مولانا ناظم ندوی بھی ان کے ہم درس تھے، اب وہ کراچی میں ہیں، اُن کا ذکر آتا تو کہتے کہ اُن سے ایک بار ملاقات ہو جاتی تو پھر دنیا سے جانے کا افسوس نہ ہوتا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کا بھی ان کا ساتھ رہا، اُن کی ہر دلعزیزی کے جلوؤں، اُن کی محبوبانہ اداؤں، اور اُن کی علمی دلربائیوں کا تو وظیفہ پڑھتے رہتے،

....۰....

اُن کے تین محبوب استاد تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حمید حسن خاںؒ اور مولانا شبلی جیراجپوری مرحوم، ان تینوں کا ذکر خیر اس طرح کرتے، جیسے ابھی ابھی

اُن سے مل کر آئے ہیں، سید صاحبؒ کی گھریلو زندگی کے کچھ واقعات ایسے سناتے کہ اُن کی خبر مجھ کو بھی نہ تھی، حالانکہ مجھ کو اُن کے گھر کے اندر بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وہ سید صاحبؒ کی علمی جلالت کے بے حد قائل تھے، کہتے کہ اُن کے ایسا روشن دماغ اور دیدہ ور عالم عرصۂ دراز تک پیدا نہ ہو سکے گا، وہ مولانا حمید حسن خاںؒ سے گرویدہ ہو کر اُن سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اُن کی آن بان اور تدریسی شان کا ذکر مزے لے لے کر کرتے، **معارف** میں اُن پر جو مضمون لکھا تو لکھتے وقت اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی فکر میں رہے، انھوں نے مولانا شبلی جیراجپوری پر بھی معارف میں ایک مضمون لکھا تو اُن کے پاس خطوط آئے کہ مولانا مرحوم کی اصلی عظمت اس مضمون سے معلوم ہوئی،

....۰....

کلام مجید کا درس دینے اور عربی زبان سکھانے میں اُن کو خاص لذت ملتی، تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں، اور ادبی بذلہ سنجیوں کے ساتھ کلام پاک کے رموز و نکات مزے لے لے کر بیان کرتے، چالیس روز میں عربی سکھا دیتے، اُن کے عربی کے قاعدے ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہیں، بچوں کی ذہنی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، دارالمصنفین سے بچوں کے لئے اُن کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئیں تو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہتی ہیں، وہ جہاں بھی رہتے، اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، اُن کی خاطر ارباب حل و عقد سے بھی اختلاف کرتے، چاہے وہ اُن کے عزیز دوست ہی کیوں نہ ہوتے،

....۰....

وہ ایک شفیق شوہر بھی تھے، اُن کے دوستوں کی بیویوں کو رشک ہوتا کہ اُن کے

شوہر بھی اُن ہی کی طرح ہوتے، اُن کے بچے اُن کی شفقت و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں جس طرح پلے، کم بچے اپنے باپ کے زیر سایہ اس طرح پلے ہوں گے، اُن کے یہاں دھتکار اور پھٹکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، اُن کے پیار اور چمکار سے اُن کے گھر کی فضا خوشگوار بنی رہتی،

......٭......

اُن کی خطابت کی بھی عجیب دلربایانہ شان تھی، جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، تو معلوم ہوتا کہ

ع بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

وہ چٹکلے اور گھریلو قصے بیان کر کے اُن کو کلام پاک کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ اُن سے نہ صرف اُن کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی فضا پیدا ہو جاتی، بلکہ سامعین بھی اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے، دارالمصنفین اُن کے خطبے کی وجہ سے بھی بیت الحکمت اور مذہبی تربیت گاہ بن گیا تھا،

اُن کا علمی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، جو کچھ پڑھا تھا، مستحضر رہا، کلام پاک، تفسیر، حدیث، رجال، علم کلام، تصوف، تاریخ، ادب، سیاست، حتیٰ کہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر جب کبھی گفتگو آ جاتی تو کچھ نہ کچھ ایسے نکتے بیان کر جاتے کہ یکایک ذہن کے دریچے کھل جاتے، یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ راقم نے اُن کے بعض ایک دو جملوں پر معارف کے لئے لمبی لمبی تحریریں لکھیں، وہ علمی مشورے کچھ ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں، وہ علمی کاوشوں کے لئے جس طرح اکساتے، خفتہ علمی جذبات کو

جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے، وہ نہ صرف میرے بلکہ دارالمصنفین کیلئے بڑی دولت رہی، وہ ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علمی بصیرت کا درس لیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی صلاحیت ہو،

......٭......

وہ مسلمان اور عصری تقاضے، سورۂ بقرہ کی تفسیر، ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، عربی کے دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، (پارہ الم) اور قرآن مجید کی دوسری کتاب (سیقول) وغیرہ کے مصنف تھے، مگر میرے لئے وہ بہت سی اور یادیں بھی چھوڑ گئے ہیں، ان کا وہ درد بھی یاد آئے گا، جو وہ دارالمصنفین کے لئے اپنے پاک اور بلور کی طرح جھلکتے ہوئے دل میں رکھتے تھے، وہ لمحات بھی یاد آئیں گے، جب ہم دونوں دارالمصنفین کے سبزہ زار پر بیٹھ کر اس کے مستقبل کو سوچتے، وہ سامنے کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ اس ادارہ کی علمی روایات میں گلاب ہی کی شادابی اور رنگینی رہی ہے، کیا وہ آیندہ بھی باقی رہے گی، پھر مایوسانہ لہجے میں کہتے کہ دارالمصنفین کے اسلاف نے خدمت اور ایثار کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اب نہیں ملیں گے، یہ پیسے کے پیچھے دوڑ لگانے کا دور ہے، مگر وہ اس مایوسی کو دور بھی کرنے کی کوشش کرتے، کبھی چاندنی راتوں میں ہم دونوں دارالمصنفین کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، تو وہ بشارت دیتے کہ ہم لوگوں کو پُر امید رہنا چاہئے، اس علمی مرکز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی انشاء اللہ برابر چھٹکی رہے گی،

......٭......

وہ حوصلہ افزائی کرنا خوب جانتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات سے میرا سینہ اندوہ و غم کا آتشدان بنا ہوا تھا، مگر انھوں نے اپنی مدبھری باتوں

سے اس کو امیدوں کا گلزار بنا دیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد پھر یہ سوز غم کا تنور بن جائے گا، یہ اب ایک گنجِ شہیداں بن چکا ہے، اس میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولنا عبد السلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، اور اب مولانا عبد السلام قدوائی مدفون ہیں، میری حیثیت اب ایک مجاور کی ہے جو اپنے سینے کے قبرستان میں اُن کی یادوں کا لوبان جلانے کے لئے رہ گیا ہے،

......

چوالیس سال پہلے دار المصنفین آیا تو اس کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وجہ سے علم کا عشرت کدہ سمجھنے میں لذت محسوس کی، پھر مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے زمانہ میں بھی اس کو اپنے لئے علم کا گلکدہ سمجھتا رہا، مولانا عبد السلام قدوائی کی رفاقت سے بھی یہ میرے لئے علم کا خم کدہ بنتا جا رہا تھا، مگر اب زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ کہیں مجھکو خود یہ نہ کہنا پڑے :-

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

......

مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم کی نیکیاں اور خوبیاں اُن کے سفر آخرت کے لئے زاد و راہ ہیں، دعا ہے کہ ان ہی کی بدولت مغفرت کی کوثر و تسنیم سے ضرور سیراب ہوں آمین ثم آمین، اُن کی سیرت کی رعنائیوں، اُن کے کردار کی دل آویزیوں، اور اُن کی گونا گوں خوبیوں کو سلام اور لاکھوں سلام بھیجتا ہوں تو اس وقت دار المصنفین کی ہر سمت سے یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ

ع گلے برفت نیاید بصد بہار دگر!

......

مقالات

مُطالعۂ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات

(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از

مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۲)

اساطیر الاوّلین | قرآن پاک میں جو قصّے انبیاے سابقین کے منقول ہیں، انھیں اُس عہد کے یہود و نصاریٰ اساطیر الاوّلین سے تعبیر کیا کرتے تھے، قرآن پاک میں ہے،

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (انفال ۴)

جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا، ہم چاہیں تو ہم بھی ایسے قصّے بیان کر دیں، یہ تو پہلوں کی کہانیاں ہیں،

جن واقعات کو قرآن پاک میں دہرا دیا گیا ہے وہ مصدقہ ہیں، اُن کے بیان کرنے میں تو کلام ہی نہیں، مگر اُن کے علاوہ جو بھی ہیں، وہ اساطیر الاولین ہی ہیں، جو یہود و نصاریٰ کا علمی سرمایہ ہیں، اگر ان میں شرک و کفر کی آمیزش نہیں ہے تو اُن کے بیان میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ہے

اور اُن کے ذکر و اذکار کی ممانعت بھی نہیں ہے، ایسے ہی قصص و حکایات سے بہت سی ضرب الامثال اور کہاوتیں وجود میں آئی ہیں، مثلاً ہر فرعونے را موسیٰ، طوفانِ نوحؑ، لحنِ داؤدی، صبرِ ایوبؑ، گریۂ یعقوب، خرِ عیسیٰ ...... ان سے تلمیح، اور استعارہ و کنایہ کا کام لیا جاتا ہے، اور مختصر بیان میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے، اسلامیوں نے علمی مسائل میں کبھی تعصب و تنگ نظری سے کام نہیں لیا، وہ علم و حکمت کو اپنا ہی گم گشتہ سرمایہ تصور کرتے تھے، اس باب میں اُن کی سیر چشمی ہر کہیں جلوہ گر ہے، لہٰذا حسب ضرورت اساطیر الاولین سے بھی خاطر خواہ کام لیا جاسکتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہو،

اسرائیلیات انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعض حالات و واقعات اور قصص قرآنِ پاک میں مذکور ہیں، ان کے علاوہ کچھ حالات و واقعات اور قصص علمائے بنی اسرائیل کے علم میں تھے ان میں بعض تو ایسے عالم تھے، جو باتوں کو چھپاتے تھے، بلکہ مقدس کتاب توریت میں تحریف کردیا کرتے تھے، اُن کی باتوں پر اگرچہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن انکار کے لئے بھی قوی دلیل نہ تھی، اُن کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا تصدقوھم و لا	نہ تو اُن کی تصدیق کرو اور نہ
تکذبوھم،	تکذیب کرو،

بعض توریت مقدس کی پیشین گوئیوں پر غور کرتے اور حق کی تائید کرتے تھے، ورقہ بن نوفل، اور عبداللہ بن سلامؓ ایسے ہی حق پرستوں میں سے تھے، ایسے علمائے بنی اسرائیل کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے،

حدّثوا عن بنی اسرائیل	بنی اسرائیل سے بیانات نقل کرو،
وَلا حرج،	اس میں حرج نہیں ہے،

لہٰذا بعض واقعات و حالات اور قصص جو مفسرین نے علمائے بنی اسرائیل سے نقل کئے ہیں اور جنھیں اسرائیلیات کہتے ہیں، ان سے استفادہ میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اُن کے اندر کوئی ایسی بات نہ ہو، جو انبیاء علیہم السلام کی شان اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو، انھی کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لا حرج فرمایا ہے لیکن جو روایات بنی اسرائیل سے متعلق نہیں، انھیں اسرائیلیات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، خرقہ و گلیم، کلاہ و طاقیہ کو اسرائیلیات میں شمار کرنا یا خرافات بتانا درست نہیں ہے، وہ دراصل علامات ہیں اصولِ سلوک کی پابندی کی، جیسا کہ عہدِ حاضر میں بیج کی نوعیت ہے، جو درویش خلاف ورزی کرتا، تو اس سے یہ علامات ضبط کرلی جاتی تھیں،

یوسفؑ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی تصدیق قرآن پاک سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں اس قصے کو احسن القصص کے لقب سے ذکر کیا گیا ہے، جتنا کچھ قرآن پاک میں ہے، وہ جامع و مستند ہے، مگر اس قصے کی بعض روایات سے اہلِ کتاب کے علماء واقف تھے، اگرچہ ان کا وہ مقام نہیں جو قرآن پاک کے بیان کا ہے، تاہم اس میں شرک و کفر کی آمیزش بھی نہیں ہے، اس لئے حدّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج کے حکم میں داخل ہیں بعض علمائے اسلام خصوصاً مفسرین نے ان روایات کو جس طرح سُنا نقل کردیا ہے، صوفیائے کرام نے بھی ان روایات سے استفادہ کیا ہے،

سید علی ہجویریؒ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) لکھتے ہیں:-

چوں یوسفؑ با یعقوبؑ رسید خداوند	جب حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ
ویرا وصال یوسف کرامت کرد،	کے پاس پہنچے، اور اللہ پاک نے انھیں
زلیخا را جوان کرد، با سلام راہ نمود	یوسفؑ سے ملایا، زلیخا کو جوان کیا،

دبزنی یوسفؑ داد، یوسف قصدے وے کرد، زلیخا از وے گریخت،...... (کشف المحجوب ص ۲۶۲)

اسلام قبول کرنے کی توفیق دی، اور حضرت یوسفؑ کی زوجہ بنایا یوسف نے ان کا ارادہ کیا تو زلیخا نے آپ سے گریز کی ...."

مولانا جامیؒ نے مثنوی یوسف زلیخا کو اسی آب و رنگ سے رشکِ بہار بنایا ہے، فرماتے ہیں

(۱)

چوں فرماں یافت یوسفؑ از خداوند　　کہ بندد با زلیخا عقد پیوند

بقانونِ خلیلؑ و دینِ یعقوبؑ　　بر آئینِ جمیل و صورتِ خوب

زلیخا را بعقدِ خود درآورد　　بعقدِ خویش یکتا گوہرآورد

چو صدقش بود بیروں از نہایت　　بآخر کرد در یوسفؑ سرایت

(۲)

شبے از چنگ یوسفؑ شد گریزاں　　خلاصی جست از افتان و خیزاں

چو زد دست از قفا در دامنِ او　　ز دستش چاک شد پیراہنِ او

زلیخا گفت اگر من بر تنِ تو　　دریدم پیش ازیں پیراہنِ تو

تو ہم پیراہنم اکنوں دریدی　　بپاداشِ گناہِ من رسیدی

حضرت یوسفؑ اور حضرتِ زلیخا کے نکاح کا ذکرِ خیر ہمارے ادب و تصوف اور اسلامی روایات کی زینت ہے، حضرت باباصاحبؒ کی زبانِ مبارک پر بھی آیا ہے، آپ نے غلباتِ شوق میں ارشاد فرمایا،

"چوں حضرت یوسف علیہ السلام پیغامبر صلوٰۃ اللہ علیہ زلیخا را بخواست، و زلیخا

در دین حضرت یعقوبؑ پیغام بر درآمد، بعد ازاں زلیخا بخدائے تعالیٰ مشغول شد، چنانچہ می آرند آں روز کہ حضرت یوسف پیغامبر علیہ السلام دنبالۂ زلیخا کردے، وا ونر پیش بگریختے و دست در زدے، آں گاہ حضرت یوسفؑ از زلیخا پرسید، گفت، روزے آں بود کہ دنبالِ ما می کردی، و من از پیش تو می گریختم، و یک روز اینست کہ دنبالِ تو می کنم و تو از من می گریزی، دریں امر حکمت چیست ؟ بگو، زلیخا گفت، اے یوسفؑ آں روز با خدائے تعالیٰ آشنائی نداشتم، و از پرستشِ او دور بودم، جز تو آشنائے دیگر نمی دانستم ضرورتاً با تو آویزش داشتم، اما ازیں زماں کہ حق تعالیٰ را بشناختم و در پرستشِ او مشغول شدم و از مجاہدہ بمشاہدۂ او تافتم و دوستی او در دل من جائے گرفت پس اے یوسفؑ تو و صد ہزار بہتر از تو در نظر من نباشد چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد اگر بعد ازیں با غیرِ او الفت گیرم مدعی دروغ زن بودم، نہ صادق در محبت،　　(اسرار الاولیاء ص ۷)

اس مختصر سے بیان میں کئی جملے ایسے ہیں، جو بے ساختہ زبان سے نکل گئے ہیں جو بیان کی جان اور روح رواں ہیں، اور ایسے ہی بزرگ کی زبان سے نکل سکتے ہیں، جو توحید و حق شناسی کی نعمت سے مالامال ہو، اور وہ یہ ہیں :-

"ازیں زماں کہ حق تعالیٰ را بشناختم — در پرستشِ او مشغول شدم — از مجاہدہ بمشاہدۂ او تافتم — چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد — اگر بعد ازیں با غیرِ او الفت گیرم، مدعی دروغ زن بودم —

ہر کس و ناکس کی زبان سے یہ جملے نہیں نکل سکتے، ان میں ایسا کیف ہے کہ یہ صاحبِ ذوق سلیم کو آج بھی متوالا بنا دیتے ہیں، اُن کی کیفیت اُن کی صداقت کی روشن دلیل ہے، اور

لائقِ تسلیم ہے، مگر اس روایت کے متعلق اور اس جیسی دوسری روایات کے متعلق عہدِ حاضر کے ایک تنقید نگار کا بیان یہ ہے:۔

"بداحتیاطی اور کم علمی کی وجہ سے جابجا ایسی باتیں بکثرت آگئی ہیں، جو اصولِ تصوف کے خلاف ہیں، بلکہ اکثر تعلیمات اسلامی کے منافی ہیں، اور جن کا انتساب کسی بھی درویش سے درست نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ انھیں حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کیا جائے۔"

(منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۶۶ جلد ۴۹ شمارہ ۵-۴-۶-۵)

بعد ازاں اسرار الاولیاء سے حضرت بابا صاحبؒ کا مذکورۂ بالا بیان نقل کرکے یہ لکھا ہے:

"حضرت یوسفؑ کے زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہ یہودی ماخذ میں ہے، نہ علمائے اسلام اس کے قائل ہیں، جامع ملفوظات نے خدا جانے یہ خرافات کہاں سے نقل کی ہیں۔" (منادی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۶۸، جلد ۴۹، شمارہ ۵، ۴-۵-۶)

یہودیوں کے علمی ذخائر میں اگر اب حضرت یوسفؑ کے حضرت زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہیں ہے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ کہنا کہ جو کہا گیا ہے بلا دلیل ہے کیونکہ یہ تو ان کی دیرینہ عادت ہے، قرآن و حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، اسی عادت کی بدولت وہ توریت مقدس کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے ہیں، لیکن جب قدیم و مستند علمائے حق نے دونوں کے نکاح کے متعلق معتبر و مسلمان یہودی علماء سے اس روایت کو نقل کیا ہے، تو یہ کہہ کر اسے مسترد کیسے کیا جا سکتا ہے، کہ روایت یہودی ماخذ میں نہیں ہے، اور اسے خرافات سے تعبیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟

مولانا جامی وہ بزرگ عالم ہیں، جن کی شرح جامی آج تک دینی مدارس کے

نصابِ تعلیم میں داخل ہے، حضرت داتا گنج بخشؒ اور مولانا جامی کی روایات کو خرافات سے تعبیر کرنا اور یہ لکھنا

"بداحتیاطی اور کم عقلی .... اصولِ تصوف کے خلاف ......
اکثر تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہیں"

بذاتِ خود کھلی خرافات ہے، بقول جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اسے فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایات، فساد فی الرسوخ، فساد فی العقیدہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور چونکہ اس زہر افشانی سے عوام اور کم علم گمراہ ہوتے ہیں، اور عقیدتمندوں میں اشتعال پیدا ہوتی ہے، جو فتنہ و فساد کا سبب بھی ہو سکتی ہے، اس لئے فساد فی الارض سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے،

علم مجلسی سے آگاہی

ہر شائستہ قوم کے مہذب افراد علم مجلسی سے آگاہی رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو واقعہ جن الفاظ میں کسی ایک مجلس میں بیان کیا جاتا ہے، بعینہٖ ان الفاظ میں کسی دوسری مجلس میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اقتضائے حال کے مطابق واقعہ کی تفصیل میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے، مقرر و متکلم کو یہ حق ہے کہ وہ واقعہ کے جس پہلو کو چاہے بیان کرے، اور جس کو نہ چاہے، بیان نہ کرے، پورا واقعہ بھی بیان کر سکتا ہے، اور متعلقات پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے، اور اختصار سے بھی کام لے سکتا ہے،

تحریر میں کسی واقعہ کو عموماً جامعیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، اور اختصار سے بھی، بہر حال ایجاز و اطناب سے کام لینے کا اسے پورا پورا حق ہوتا ہے، مکرر بیان کرنے اور لکھنے کی صورت میں الفاظ میں رد و بدل ہوتا اور ہو سکتا ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ جو واقعہ کسی نے قلم بند کر لیا ہے، اور مدتوں بعد اسے بیان کیا ہے، تو بیان میں تحریر سے زیادہ

توانائی آسکتی ہے جس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، یہاں تین ایسے واقعات نقل کئے جاتے ہیں جن کو بیان کرنے والے بھی ایک ہی بزرگ ہیں، اور لکھنے والے بھی ایک ہی اہل قلم ہیں، دونوں بیانوں کے درمیان فصل بھی کچھ زیادہ نہیں ہے،

(۱)

یک روز ہمہ یاراں زحمت مرا
وچند یاراں را گفت کہ بروید در
فلاں حظیرہ بہ شب بیدار باشید،
وبرائے صحت من دعا کنید ہم چناں
کردیم، من وچند یار دیگر دراں
حظیرہ رفتیم، آں حظیرہ بام می داشت
براں بام رفتیم، وطعام برابر خود
بردیم شب آنجا بودیم دعا کردیم چوں
روز شد، بخدمت شیخ آمدیم
وباستادیم، وعرض داشت کردیم
کہ شب را بحکم فرمان بیدار بودیم
ودعا کردیم، شیخ ساعتے تامل
فرمود، بعد ازاں گفت از دعائے
شما ہیچ اثر صحت پیدا نہ شد خواجہ
ذکرہ اللہ بالخیر فرمودند کہ من در

ودرآنچہ شیخ الاسلام فرید الدین
قدس اللہ سرہ العزیز زحمت داشت
مرا باچند یار بزیارت شہیداں
کہ آنجا اند فرستادہ بود، چوں
ما بعد از زیارت بخدمت پیوستم،
فرمود کہ دعائے شما ہیچ اثر نہ
کرد، مرا ہیچ جوابے فراہم نیامد
یارے بود، کہ او را علی بہاری
گفتندے، او در تر
استادہ بود، گفت کہ ما ناقصانیم
وذات مبارک شیخ کامل، ودعائے
ناقصاں در حق کاملاں چہ گونہ
اثر کند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود
کہ این سخن بسمع شیخ نہ رسید من عین
آں بسمع مبارک رسانیدم، مرا

جواب متامل شدم یارے
بود کہ او را علی بہاری گفتندے
او از من پیشتر استادہ بود، او
ازاں جا گفت کہ ما ناقصانیم
وذات مبارک شیخ کامل،
دعائے ناقصاں در حق کاملاں،
کجا مستجاب شود، ہمانا کہ ایں
سخن بسمع شیخ نہ رسید، من ایں
سخن بسمع شیخ رسانیدم، بعد
ازاں روے سوے من کرد و
گفت من از خدا خواستہ ام
کہ ہرچہ تو از خدا خواہی بیابی
بعد ازاں عصائے خود بمن داد
..... (فوائد الفواد ص ۲۵ مجلس
بست ہفتم از ۲۷ ماہ ربیع الاول

(۷۱۹ھ)

فرمود من از خدا خواستہ ام کہ
ہرچہ تو از خدائے تعالیٰ بخواہی
بیابی، بعد ازاں آں روز عصا بمن
داد و مرا گفت کہ تو و بدر الدین اسحاق
علیہ الرحمۃ بروید و درآں حظیرہ
مشغول شوید، من و او ہر دو رفتیم
و شب مشغول بودیم، چوں بخدمت
پیوستم فرمود کہ نیکو بود،
(فوائد الفواد ص ۵۹ مجلس ۵ پنجم
(رجب) سنہ ۷۱۹ھ)

دونوں بیانات کے درمیان صرف تین ماہ سات یوم کا فصل ہے، درمیان میں چھ مجالس ہیں جن کے بیانات تقریباً دس صفحات پر مشتمل ہیں، مگر بیان میں جو فرق ہے، وہ مقابلہ سے واضح ہے، پہلے بیان میں حظیرہ۔ بام حظیرہ ہے، کھانا ساتھ لے جانے کا ذکر ہے، دوسرے میں صرف زیارت شہدا ہے، پھر پہلے بیان میں بعد ازاں عصائے خود بمن داد سے ایسا لگتا ہے

کہ عصائے خود اسی وقت عطا فرمایا تھا، دوسرے بیان سے کہ آن روز عصا بمن داد" یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن میں کسی وقت عطا فرمایا تھا، عصائے خود میں جو تخصیص ہے وہ بھی اس میں نہیں ہے، اگر اسی اختلاف سے یہ بیان افضل الفوائد میں ہوتا، تو اس پر سرقہ کا بھی الزام عائد ہوتا، اور اسلوب بیان کی خامی کا بھی،

(۲)

حکایت خواجہ شاہی موئے تاب
کہ برادر مہتر او (شیخ محمود موئے
تاب) بود، فرمود، چوں خلق بدو
روے آورد و ہر جا کہ می رفت آنجا
جمیعتے می شد۔ و ایں خواجہ شاہی
موئے تاب مردے سیہ فام بود،
ہمدراں عہد درویشے بود در
بدایوں او را مسعود نجاشی گفتندے
چوں خواجہ شاہی را بہ آں غوغا
می دید، می گفت اے سیہ! اگر ما
بہ گرم کردہ بسوختہ خواہی شد
خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ ہم
چناں شد کہ او گفتہ بود ہم دراں
(فوائد الفواد ص ۱۷۲ مجلس ۳۷
دہم ماہ ذی قعدہ ۷۱۶ھ)

حکایت خواجہ شاہی در افتاد
کہ او را در بدایوں رونقے پیدا شد
و ہمہ خلق روبرو آوردند۔ و ہر جا کہ
می رفت آنجا جمیعتے می شد و آں
خواجہ شاہی مردے سیاہ فام
بود، ہمدراں عہد درویش بود،
او را محمود نجاشی گفتندے۔ وقتے
خواجہ شاہی را گفت اے سیہ!
گرما بہ نیک گرم کردہ، سوختہ
خواہی شد۔ ہم چناں شد کہ او
گفت خواجہ ہم دراں جوانی برفت
(فوائد الفواد ص ۱۷۶ مجلس ۳۸
یازدہم ماہ ذی الحجہ ۷۱۶ھ)

دونوں بیانات کے درمیان صرف ایک ماہ کا فصل ہے، درمیان میں کوئی مجلس بھی نہیں ہے، اور درمیان میں صرف ایک صفحے کا بیان ہے، موئے تاب صرف پہلے بیان میں ہے، دوسرے میں نہیں ہے، درویشے اور درویش میں امتیاز واضح ہے پہلے بیان میں مسعود نجاشی ہے، اور دوسرے میں محمود نجاشی ہے، گرم کردہ اور نیک گرم کردہ میں بھی امتیاز ہے، پہلے بیان میں، بہ آں غوغا می دید، می گفت ہے، اور دوسرے میں صرف گفت ہے، تواتر مفقود ہے، تنقید نگار بتائیں کہ وہ ان اختلافات کی کیا تاویل فرماتے ہیں کس کو جعلی اور کس کو اصلی بتاتے ہیں،

(۳)

حکایت فرمود کنیزکے داشت
نو بردہ و زال دمواسی است،
نزدیک بدایوں کہ آنرا کانبھر
گویند، مگر از اں مواسی بودہ
است، روزے ایں کنیزک
می گریست، مولانا علاء الدین
پرسید کہ چرا می گرئی، گفت پدرے
دارم، از او جدا شدم، مولانا
گفت اگر ترا بر سر حوض برم
کہ یک کروہے از شہر است و
و بر سراں حوض راہ کانبھر

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود
آرے ہم چنیں بود کہ او کنیزک
زالے داشت نو بردہ در بدایوں
سحر گاہے مولانا بیدار شد آں کنیز
آمد، آس می کرد و می گریست
مولانا پرسید چرا می گرئی، کنیزک
گفت پدرے در مواس کانبھر
گزاشتہ ام، از جدائی او
می گریم، مولانا گفت اگر من ترا
نزدیک نماز گاہ برم از آں جا
راہ خانہ خود بدانی، و گفت آرے

است، ازاں جا تو راہ خانہ خود بدانی
گفت بدانم، مولانا وقت سحرے
او را از خانہ بروں آورد، و بر سرآں
حوض برد، و بگذاشت، خواجہ
ذکرہ اللہ بالخیر، چوں بریں حرف
رسید چشم پر آب کرد، فرمود کہ
علمائے ظاہر ایں معنی را منکر
باشند، اما تواں دانست کہ او چہ کرد

(فوائد الفواد ص ۱۶۵ مجلس ۳۴
پانزدہم ماہ رمضان ۷۱۶ھ)

ازاں جا راہ خانہ خود بدانم
مولانا علاء الدین نانے چند بدو داد
و او را بر سر راہ کانبھر بردو
گزاشت،

(فوائد الفواد ص ۲۰۲ مجلس ۵۳
یازدہم ماہ رمضان ۷۱۸ھ)

ان دونوں روایتوں کے درمیان فصل زیادہ ہے، درمیان میں بارہ[۱۲] فصلیں ہیں، جو ۳۵ صفحات پر مشتمل ہیں، بیان میں بھی ممیز فرق ہے، اگر یہی فرق کسی دوسرے مجموعۂ ملفوظات میں ہوتا، تو تنقید نگاروں کو سخت اعتراض ہوتا، پہلی روایت میں رونے کا تو ذکر ہے، مگر سکی پیتے ہوئے رونے کا ذکر نہیں ہے، پہلی روایت میں حوض کا ذکر ہے، جس کا فاصلہ شہر سے ایک کوس بتایا ہے، دوسری روایت میں نماز گاہ (عیدگاہ) کا ذکر ہے، مگر فاصلے کا ذکر نہیں ہے، دوسری روایت میں نانے چند بدو داد ہے، پہلی میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، پہلی روایت میں نتیجتاً جو کچھ فرمایا، وہ دوسری میں نہیں ہے، ان اختلافات سے روایات میں بہم سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اگر ایسے ہی اختلافات کسی کتاب کے جعلی ہونے کے دلائل ہیں، تو تنقید نگار بتائیں کہ فوائد الفواد سب سے زیادہ جعلی کتاب کیوں نہیں ہے جس میں ایک ہی واقعہ کو مختلف اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، تنقید نگا

کا بیان ہے:-

"حضرت امیر حسن دہلوی کے مرتب کردہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات فوائد الفواد (Fawaidul Fuwad) امیر خورد کرمانی کی تالیف سیر الاولیا، اور حمید قلندر کے جمع کئے ہوئے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے ملفوظات خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہیں"

(منادی دہلی ۱۹۷۰ء بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴، ۵، ۶ ص ۱۳)

اگر اس قدر اختلاف کے باوجود فوائد الفواد نہایت درجہ مستند ہے، تو ایسے ہی اختلافات کی بنا پر دیگر ملفوظات جعلی کیسے ہو سکتے ہیں، وہ بھی نہایت درجہ مستند ہونے چاہئیں، حالانکہ اُن کے متن میں اختلاف نہیں ہے، اس کے متن میں اختلاف ہے......

....کسی دوسری کتاب کے بیان سے اختلاف ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ---

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ خود حضرت نظام الدینؒ اپنی مجلس میں ایک واقعہ بیان کریں، اور اسی واقعہ کو اپنے قلم سے کتاب میں لکھیں، اور دونوں میں اتنا اختلاف ہو"

(منادی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۴۹ جلد ۴۹ شمارہ ۴، ۵، ۶ سنہ ۱۹۷۰ء)

یہ اختلاف اسی طرح ممکن ہے، جس طرح فوائد الفواد میں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ امکان رکھتا ہے، جس طرح مختلف مجالس میں ایک ہی واقعہ کے بیان میں اختلاف ہے، اہل علم اس نکتے سے واقف ہیں کہ ایسے اختلافات ہوتے ہی ہیں، اگر نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے، جو فن انشا پردازی اور فن تقریر سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تحریر و تقریر

میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، کوئی مقرر لفظ بہ لفظ وہ بیان ہی نہیں کرسکتا، جو تحریر
میں ہوتا ہے، اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ملفوظات میں جو اختلاف ہے
وہ ملفوظ نگار کی بد احتیاطی، کم عقلی، اصولِ تصوف اور اسلامی شریعت سے عدم واقفیت
کا نتیجہ نہیں ہے، لطیفہ یہ ہے کہ تنقید نگار نے جن دو بیانوں کے درمیان فرق کرنا ممکن تصور
کیا ہے، اُن کے درمیان چالیس سال سے زیادہ کا فصل ہے، لکھنے والے بھی مختلف ہیں،
اور بیان کرنے والے بھی مختلف ہیں، مگر فوائد الفواد میں یہ صورت نہیں ہے، نہ بیانات
کی مدت میں اتنا فصل ہے نہ بیان کرنے والے مختلف ہیں، اور نہ لکھنے والے مختلف ہیں،
پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ ایک کتاب اسی دلیل سے جعلی قرار پائے، اور دوسری مستند
مانی جائے،

اعزازی کلمات کلمات و الفاظ کے بعض جگہ ایسے ہیں، جو اعزازی طور پر بزرگوں
اور قابلِ احترام اشخاص کے ناموں کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے ہیں، مثلاً رحمۃ اللہ علیہ
علیہ الرحمۃ، رضی اللہ عنہ، انار اللہ برہانہ، ذکرہ اللہ بالخیر، قدس اللہ سرہ العزیز وغیرہ
یہ عربی مرکبات ہیں، یہ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں، جو
بقیدِ حیات ہیں، اور اُن کے لئے بھی جو وفات پاچکے ہیں، انہیں "اصطلاحِ اموات" جیسے
غیر معروف مرکب سے نامزد کرنا، اور یہ سمجھنا اور لکھنا کہ یہ صرف اُن ہی اشخاص کے لئے مخصوص
ہیں جو فوت ہوچکے ہیں، اور عالمِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، صحیح نہیں ہے، اور نہ اصطلاحات
کی کسی کتاب سے یہ ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے، کہ ان کلمات و مرکبات پر اصطلاحِ اموات
کا اطلاق ہوتا ہے،

اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ علماے فن کے کسی گروہ نے کسی لفظ کو اس کے اصلی و

لغوی معنی کے علاوہ کسی اور معنی کے لئے مخصوص کرلیا ہے، جیسے منطق و فلسفہ، صرف و نحو، حدیث
و فقہ کی اصطلاحات ہیں، اسی طرح پیشہ وروں کی اصطلاحیں بھی ہیں، جو ان فنون کی کتابوں
میں مدون ہیں، اصطلاحات پر مخصوص کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جو لوگ ان جگوں کو اصطلاح
اموات سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا ثبوت فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے، جو بزرگ رحلت
پاچکے ہیں، ان کے ناموں کے ساتھ ان جگوں کا استعمال عام ہے، اس کے برعکس ان
اشخاص کے لئے بھی ان جگوں کا استعمال ملتا ہے، جو بقیدِ حیات ہوتے ہیں، آج نہ سہی
مگر کل تک یہی تھا،

(۱) سید علی ہجویری حضرت داتا گنج بخشؒ لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ) نے جا بجا
اپنے لئے ان جگوں کو لکھا ہے:-

"من کہ علی بن عثمان جلابی ام رضی اللہ عنہ (کشف المحجوب ص ۲-۲۶۲، ۳۲۳)

(۲) اجودھن (پاکپٹن) کے قاضی ابوالفضل عبداللہ حضرت باباصاحبؒ کے بڑے
مخالف تھے، وہ سماع کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کے لئے ملتان گئے، جہاں مشہور مشہور
علما تھے، انھوں نے علمائے ملتان سے کہا کہ یہ کہاں جائز ہے کہ کوئی شخص مسجد میں سماع
سنے، اور رقص کرے، انھوں نے دریافت کیا، ایسا کون شخص ہے تو انھوں نے کہا:

"شیخ فریدالدین قدس سرہ العزیز (است)" (فوائد الفواد ص ۹۶)

یہ واقعہ حضرت باباصاحب کی حیات کا ہے کہ آپ کے مبارک نام کے ساتھ قدس
سرہ العزیز بولا گیا ہے،

(۳) حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ ایک بار حضرت باباصاحبؒ نے مجھے اور کئی دوستوں کو
شہداء کے مزارات پر دعا کے لئے بھیجا تھا، جب ہم واپس آئے اور حاضرِ خدمت ہوئے تو

آپ نے فرمایا " دعائے شما ہیچ اثر نہ کرد" القصہ پھر مجھے اور مولانا بدرالدین اسحاق کو بھیجا، حضرت محبوب الٰہی کے مبارک لفظ ہیں :۔

" مرا گفت کہ تو و بدرالدین اسحاق علیہ الرحمۃ بروید او ہمدر داں حظیرہ مشغول شوید، (فوائد الفواد ص ۵۹)

یہ بیان ہر اعتبار سے معتبر ہے، کہ یہ حضرت بابا صاحب کا بیان ہے، پھر اس کا اعادہ فرمایا ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے تنقید نگاروں کے لئے سب سے زیادہ اہم اسلئے ہے کہ فوائد الفواد میں ہے جو اُن کے کہنے کے مطابق نہایت درجہ مستند ہے، جس کے بعد مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی،

(باقی)

بزمِ صوفیہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ بزم صوفیہ کا تیسرا ضخیم اڈیشن جس میں تیموری عہد سے پہلے کے صاحبِ تصنیف اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابوالحسن ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ بو علی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی (کچھوچھہ) سید گیسو دراز (گجرات) وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے حالات و تعلیمات و ارشادات کی تفصیل، اُن کے ملفوظات کے مجموعوں اور تصنیفات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت شیخ عبدالحق ردولویؒ کے حالات و تعلیمات کا اضافہ مولانا شاہ معین الدین ندوی ردولوی کے قلم سے ہے، جن کا تعلق خود ماں کی طرف سے شیخ موصوف کے خانوادۂ رشد و ہدایت سے تھا، یہ بزرگ مذکورۂ بالا بزرگانِ سلوک و معرفت کی طرح صاحب کرامات و ملفوظات ہیں، اور اُن کا مزار آج تک ردولی میں مرجع خلائق ہے، (مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن) قیمت ۰۰۔۵۰؍۱۶

"منیجر"

امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

امیر خسرو صنائع و بدائع کے استعمال میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اپنی غزلوں، مثنویوں اور قصیدوں میں اس فن پر اپنی غیر معمولی قدرت کا اظہار کرتے رہے۔ یہ فن ان کے یہاں موم کی حیثیت رکھتا، اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہتے اس کو موڑ کر کوئی نہ کوئی صنعت پیدا کر دیتے۔ اپنی نعتوں میں بھی یہ فن دکھا کر اپنے کمالات سے متاثر کیا ہے، حاجی علی احمد خاں صاحب نے نثرِ خسرو کو ایڈٹ کرتے وقت اپنے مقدمہ میں ان کے ان کمالات کا احاطہ بڑی محنت سے کیا ہے۔ انھوں نے تنسیق الصفات، تقابل، ایہام، ذوقافیتین، تجنیس ناقص، تجنیس خطی، تجنیس زائد بہ اول، ردالعجز علی الصدر، ردالابتدا علی الصدر، ردالعجز علی العروض، مراعات النظیر، حسن تعلیل اور مذہب الکلامی کا استعمال جس طرح کیا ہے، ان کی مثالیں ان کے اشعار کی نشاندہی کر کے ان کے ان کمالات سے امیر خسرو کے پرستاروں کو محظوظ کیا ہے، ان ہی میں سے ہم بھی یہاں پر دو تین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ردالعجز علی الصدر۔ شاعر جس لفظ کو آخر بیت میں ذکر کرے، اسی کو اول بیت میں لائے۔

رقم کو باز نشناسد قلم را
چو داند باز نقاش رقم را

رد الابتدا علی الصدر۔ جو لفظ مصرع دوم کی ابتدا میں ہو وہی مصرع اول کے شروع میں لایا جائے،

ولایت داری از توقیع درگاہ
ولایت نامہ اولی مع اللہ

رد العجز علی العروض۔ جو لفظ مصرع دوم کے آخر میں ہو وہی مصرع اولیٰ کے آخر میں لایا جائے:

ہمیں او را بگویم سایہ یار است
وگر ہر کس کہ بینی سایہ وار است

امیر خسرو کی ایک مشہور نعتیہ غزل یہ ہے جو برابر محفل سماع میں گائی جاتی ہے،

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری پیکر نگاری، سرو قدی، لالہ رخساری
سراپا آفت دل بود شب جائیکہ من بودم

رقیباں گوش بر آواز او در ناز من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

جس محفل میں یہ نعت گائی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور محمدی سے ساری فضا منور ہو گئی ہے، ہر کس و ناکس پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، کچھ لوگ اسکو امیر خسرو کی نعت نہیں قرار دیتے کیونکہ یہ ان کے کسی دیوان میں نہیں، مگر جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ یہ کس خسرو کی نعتیہ غزل ہے، اُس وقت تک امیر خسرو کے نام سے جو یہ پُر کیف اور وجد آفریں نعت سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ منسوب ہوتی آرہی ہے، اس سے ان کو محروم بھی نہیں کیا جاسکتا، اس میں جو سوز ہے، گداز ہے، کیفیت ہے، روحانیت ہے، سراپا عجز و نیاز ہے، مستی ہے اور سرشاری ہے وہ انکے سوا کسی اور خسرو

کی شاعری میں نہیں پائی گئی ہے،

حمد و نعت کے بعد امیر خسرو التزاماً اپنے شیخ کی منقبت لکھتے ہیں، مطلع الانوار میں اپنے پیر کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اپنے رسول کی روش اختیار کیے رہے، ان کی سیرت میں سنت پیمبری ظاہر ہوتی رہی۔

راہ روے کو بطریق صفا
رفتہ قدم بر قدم مصطفیٰ

سیرت میمونش بدیں پروری
نسخۂ دیباچۂ پیغمبری

وہ غیب کی بھی خبر رکھتے اور آسمانی جلوے بھی ان کے سامنے ہوتے،

چشم یقینش بہ تماشائے غیب
در نظر او ہمہ صحرائے غیب

عصمتیانِ حرمِ آسماں
جلوہ کناں در نظرش ہر زماں

پھر اپنے مرشد کے تصوف کی شرح اس طرح کی ہے کہ وہ اپنے فروعی اور اصولی عقیدوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے تابع رہے، اور پھر بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی طریقت عین شریعت کے مطابق تھی اور اگر طریقت عین شریعت کے مطابق نہیں تو یہ شر ہے۔

سکہ کارش بفروع و اصول
تابع قال اللہ و قال الرسول

عین شریعت بہ طریقتش درست
شرع اگر عین نباشد شر است

وہ زیادہ تر اسی پر زور دیتے رہے کہ ان کے پیر نبی کے بازوئے راست اور میراث نبی کے کامل الصفات بنے رہے، یعنی شریعت کی خلاف ورزی ان کے یہاں کسی حال میں نہیں، شیریں خسرو میں جو شیخ کی منقبت لکھی تو اس میں کہتے ہیں

نظام الحق نبی را بازوئے راست
کہ چرخ از رفعتش عطف مصلاست

زدیوانِ ازل واصل خطابش
زمیراثِ نبی کامل نصابش

ان کے فیوض اور برکات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مقبولوں اور مدبروں کے لیے پناہ بنے ہوئے ہیں. جو دل رکھتے ہیں اور جو نہ بھی رکھتے ہوں ان کے راز بنے ہوئے ہیں، ان کے مرید اپنے طمانچے سے شیطان کی گردن توڑ سکتے ہیں،

پناہ مقبلان و مدبران ہم — سر صاحب دلان و بے دلان ہم
مریدانی کہ پیشش دست بستہ — بہ سیلی گردنِ شیطان شکستہ

ان کی خلوت کے جلوے کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ یہ خلد کی راہ دکھاتی ہے یہاں اللہ تعالیٰ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں

بہ کنجِ خلوتش کز خلد راہے است — عروسان رضا را جلوہ گاہے است

اپنی مثنوی مجنون لیلےٰ کی منقبت میں کہتے ہیں کہ وہ قطب زمن، پناہ ایماں، سر جملہ کرمیاں، نظام دین محمد، حجرۂ فقر میں بادشاہ، عالم دل کے جہاں پناہ، شاہنشہ بے سریر و بے تاج، پردۂ غیب کے محرم راز، راز سپہر کے کیسہ پرداز، پاک بینوں سے بیناتر اور شب نشینوں سے بیدار تر ہیں، یعنی ایک عارف باللہ میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں ان کو وہ اپنے پیر میں نظر آتی ہیں۔

قطب زمن و پناہ ایماں — سر جملہ جملۂ کرمیاں
در شرع نظام دین احمد — یعنی کہ نظام دین محمد
در حجرۂ فقر بادشاہے — در عالم دل جہاں پناہے
شاہنشہ بے سریر و بے تاج — شاہانش بہ خاک پائے محتاج
در پردۂ غیب محرم راز — وز راز سپہر کیسہ پرداز

بیناتر جملہ پاک بیناں — بیدار ترینِ شب نشیناں

اور پھر آئینۂ سکندری کی منقبت میں ان ہی باتوں کو دوسرے انداز میں کہتے ہیں، دین حق کو ان کی وجہ سے پناہ ملی اور وہ پیشوا بنے رہے۔

پناہ جہاں دین حق را نظام — وہ قدس را پیشوائے تمام

ان کی شب بیداری کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں

ہمہ شب ز شب خیزی بے ریا — کمند افگنِ کنگرہ کبریا

ان کی سجدہ ریزی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

زبس سجدہ کردن بہ محراب دیں — شدہ حاجب خاص روح الامیں

جب ان کی نمازوں کا ذکر کرتے ہیں تو یا تو اس میں شاعرانہ غلو یا مرشد سے ان کی غیر معمولی عقیدت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

نماز وے از معراج برتری — نمودار معراج پیغمبری

ان کی ولایت کی وسعت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

زمین و فلک در ولایت حدش — ولی گوشۂ بوریا مسندش

ان کو بیماری دل کا غیر معمولی طبیب بھی بتاتے ہیں

بہ بیماری دل طبیب ست فرد — کزو کردہ درماں بیازار درد

ان کی زبان اور دل کی توصیف میں کہتے ہیں

زبانش ز لوح سماراندہ حرف — دلش عشق را گنجدانی شگرف

ان کی نظر کیمیا اثر کو اس طرح دکھاتے ہیں

ز نظارۂ وے آں آفتاب — ہمہ پاک چشماں دو دیدہ پر آب

ان کی بردباری کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ ان سے زیادہ کوئی اور بردبار نہ ہو سکا

بردبار خلق ازچہ بسیار تر   کے نیست ازوی سبک بار تر

آخر میں یہ کہہ اٹھتے ہیں

چراغ بہ ظلمات آخر زماں

مثنوی نہ سپہر میں اپنے مرشد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اسرار قدسی جاننے میں فرد ہیں، شیطان سے پناہ چاہنے والوں کو انکے یہاں امان ملتی ہے، ان کا کشف معجزات سے تو کم لیکن کرامت سے بلند تر ہے، ان کے نور سے جو شمع روشن ہوتی ہے تو اس کے بعد عارفوں کے دل کا چراغ جل کر رہ جاتا ہے۔

در اسرار قدسی فرید زماں   ز شیطان پناہندہ را ذوالاماں

نمودار کشفش بہ صدق و ثبات   فزوں از کرامت کم از معجزات

ز شمع کہ نوروی افروختہ   چراغ دل عارفاں سوختہ

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ امیر خسرو کو اپنے مرشد سے کیسی محبت وعقیدت تھی، جو عین چشتیہ سلسلہ کی روایات کے مطابق تھی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے مرشد حضرت عثمان ہرونیؒ کی خدمت غلاموں کی طرح کی، سفر میں مرشد کا بستر اور دوسری ضروری چیزیں اپنے سر پر رکھ کر چلتے، (تفصیل کے لیے دیکھو بزم صوفیہ ص ۵۰ طبع سوم) ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی میں قیام کیا تو یہاں اپنے مرشد سے جدائی کی وجہ سے اپنے کو مہجور پایا اور ان سے ملنے کے لیے ان کے دل میں آتش شوق بھڑکتی رہی (ایضاً ص ۹۴) حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ پیر کو مرید اپنا حاکم سمجھے (فوائد الفواد لاہور اڈیشن ص ۲۴۹) امیر خسرو تو اپنے پیر کو حاکم اور سب کچھ سمجھنے کے ساتھ اپنا معشوق بھی سمجھتے اور بقول

مولانا شبلی ان کے عشق میں ان کا جمال دیکھ کر جیتے رہے اور ان سے اپنی محبت اور شیفتگی کے اظہار میں اپنی شاعری میں تغزل کا رنگ پیدا کر دیتے، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا کی آنکھیں شب بیداری میں شغل باطن سے سرخ ہو جاتیں تو امیر خسرو نے ان خمار آلود آنکھوں کو دیکھکر ایک موقع پر ان کو مخاطب کر کے مست ہو کر فرمایا کہ رات تو جاگتا رہا، کس کے پہلو میں رات گذاری کہ تیری مست آنکھوں میں ابتک خمار باقی ہے۔

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب   کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

پھر ایک پوری غزل بھی اپنے مرشد کی شان میں لکھی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اے پیر تیرے پاؤں کی خاک نور سعادت ہے، تو بہ کی تیری قینچی کلمۂ شہادت کے مانند ہے تیری ہستی وہ نظام ہے کہ تیرے نون نے محراب کو عبادت کے لیے سیدھا کر رکھا ہے، جس نے تیری روشنی دیکھی اور اس کو بیداری حاصل نہیں ہوئی تو وہ ایک ایسا کتا ہے جس کی عادت صبح تک سونے کی ہوتی ہے تو وہ صبح کی شمع ہے کہ تجھ سے عشق کا شعلہ اٹھتا ہے تو اس کا شرارہ ہدایت کا چراغ بن جاتا ہے، بڑے بڑے عالم جن کو انبیاء سے معرفت حاصل ہوتی ہے وہ تیرے آگے استفادہ کے لیے آجاتے ہیں، تیرا ہر مرید اپنے رکوع کی وجہ سے ہلال بنا ہوا ہے، ہر رات وہ ہلال کی طرح بڑھتا نظر آتا ہے۔ ایک مرید کہہ سکتا ہے کہ تیرا جو مرید ہے وہ ایک ایسا آدمی ہے کہ اس کی آنکھ سے کوئی فتنہ بھی پیدا ہوا تو وہ بھی سعادت کا باعث ہے، اور جب چھوٹے بوڑھے تجھ سے وصل کی امید رکھتے ہیں تو خسرو تجھ سے وصل کے بغیر حرف ارادت بنا ہوا ہے ؎

اے پیر خاک پائے تو نور سعادت است   مقراض توبۂ تو چو لائے شہادت است

ہستی تو آں نظام کہ نون خطاب تو   محراب راست کردہ برائے عبادت است

دید آنکہ طلعت تو و بیدار شیں بنود — ہست آں سگے کہ خفتنِ صبحش بہ عادتست

تو شمع صبح شعلہ شوقے کہ از تو خواست — زاں ہر یکے شرارہ چراغ ہدایت است

علامہ اے کہ معرفت انبیا لیش ہست — او را بہ پیش تو محلِ استفادتست

ہر یک مرید تو چو ہلالے است از رکوع — ہر شب ہلال وار زاں در زیادتست

نتواں مرید گفت مرید ترا کہ اوست — آں مردمے کہ فتنہ عین سعادتست

امید کز تو وصل گردد چوں فرد پیر — خسرو کہ بے وصال چو حرف ارادتست

خسرو اپنے مرشد کے ساتھ حسین راتیں کیف آفریں باتوں کے ساتھ گزارتے، بات بات پر قدم بوسی اور دست بوسی کی لذت اٹھاتے، ان کو جام معرفت کا ساقی سمجھ کر ان سے شراب معرفت پیتے تو اس کا خمار ان پر باقی رہتا، مست ہو جاتے تو اس مستی کا داغ انکے دل پر باقی رہ جاتا، ایسی عیش و نشاط بھری رات کو سوچ کر کے ان کا دل نگار بن جاتا، انکی دست بوسی اور قدم بوسی کی یاد ان کے لیے جانگسل رہتی اور وہ جو کچھ اپنے مرشد سے سنتے اس کے بعد کسی اور کی نصیحت یا بات سننا پسند نہ کرتے، کیا ان کی ایک غزل کے یہ اشعار ان ہی کیفیات کی تو غمازی نہیں کرتے؟

خوش آں شبے کہ سرم زیر پائے یار بہ ماند — دو دیدہ در رہ آں سرو گل عذار بہ ماند

شراب ہا کہ کشیدم بہ روئے ساقی خویش — بہ رفت از سر و دردِ سر و خمار بہ ماند

چراش سیر نہ دیدم کہ زود گشتم مست؟ — مرا درون دل ایں داغ یادگار بہ ماند

گذشت آں شب و آں عیش و آں نشاط ولیک — بہ یادگار دریں سینۂ فگار بہ ماند

بہ یاد پاک یکے بوسہ یادگار دہم — کہ جاں ہمی رود و دست پا نگار بماند

حدیث اہل نصیحت نہ گنجدم در دل — کہ در و رود نہ سخن ہائے آں نگار بماند

امیر خسرو نے جا بجا اپنے قصیدوں میں تصوف اور صوفی پر بھی اظہار خیال کیا ہے، وہ تصوف کی راہ میں علم کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ علم ہی سے عمل بھی بلند ہوتا ہے، نہایۃ الکمال کے قصیدہ "راہ رہائی" میں کہتے ہیں کہ

بہ علم کوش ولا اول آنگہے بہ عمل — کہ از برائے عمل علم شد بلند محل

علم کی فضیلت اس طرح بھی بیان کرتے ہیں کہ

بہ لفظ و فضل غلو کن از نبی و ولی — سخن شناسی کم باشدت بہ علم خلل

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ علم کی تحصیل ایمان کی پختگی کے لیے ہو نہ کہ علم کا اہل ہونے کیلیے ہو

خلاصہ ایست کہ علم برائے ایماں خواں — نہ بہر آنکہ بخوانند کاملانت اکمل

کہتے ہیں کہ اگر صوفی بے علم و دانش ہے تو اس کی نماز کی کیفیت ویسی ہی ہے جیسے کوئی ایک مشعل کو تیل اور فتیلہ کے بغیر جلانے کی کوشش کرے۔

نماز صوفیِ بے دانش آنچناں باشد — کہ بے فتیلہ و روغن فروزش مشعل

وہ پیر جو علم سے خالی ہو کر ظاہرداری اختیار کرتے ہیں ان کے ذریعہ سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ کتاب کی ظاہری لکیروں کو عقلمند حروف کا درجہ نہیں دیتے ہیں۔

مجوے معرفت از زنگ پوش بے معنی — کہ ہوشمند بخوید حروف در جدول

کہتے ہیں کہ وہ پیر جو پُر تکلف روزی کا خواہاں ہوتا ہے اس پر عقل ہنستی رہتی ہے

خرد بگرید بر پیر پُر تکلف رزق — گہر بخندد بر زال و رحلی و حلل

تصوف اگر گاؤں اور دولت کے لیے ہو تو یہ غارتگری ہے،

وگر تصوف تو بہر دِہ و دار است — ز بہر غارت و یغماش بگسلند سُبُل

فقر کی راہ میں تسلیم و مسکنت ہونا چاہیے

بچش حلاوت تسلیم و مسکنت در فقر چنانکہ گر رسدت زہر در کشی چو عسل

پھر اپنے قصیدوں میں عقل و عشق کی بحث بھی چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق کی منزل سخت ضرور ہے لیکن اسی کے ذریعہ سے معرفت حاصل ہوتی ہے،

عشق سخت است و لے معرفت آموز است سرمۂ سنگ است و لے نور افزائے بصر است

اس کا درجہ بلند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

بلکہ عشق آفت کہ پوشیدہ کند پائے بلند سوئے ملکے کہ برآں سوی نعیم و سقر است

یہ عشق ان کے عشقِ الٰہی، عشقِ رسول اور عشقِ مرشد میں اس طرح ظاہر ہوتا رہا کہ وہ مجسم سوزِ عشق بن گئے، جس پر ان کے مرشد کو بھی ناز رہا، اس عشق کا درس انھوں نے اپنے مرشد سے بھی حاصل کیا، خواجگان چشت کے یہاں اس عشق کی بڑی رنگا رنگی ہے،

عشق کے تخیل کی وضاحت حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے پہلے ان اشعار کے ذریعے کی ہے

سرلیست مرا در وں جاں در عشقت گر سر رود اے دوست نگویم با کس

سرلیست عاشقاں را در طاقتِ نہانی پوشیدہ دار خود را تا آنجا خجل نمانی

پھر کہتے ہیں کہ اس عشق کا عنصر صرف آگ ہے، جس کے شعلہ سے تمام عالم جل کر خاک سیاہ ہو سکتا ہے، اس عشق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ عشق اپنی دوئی کو کھو دیتا ہے، وہ عاشق بن کر اپنے معشوق کی طلب میں مجاہدہ کرتا ہے جس سے اس کو مکاشفہ ہوتا ہے، مکاشفہ کے بعد مشاہدہ یعنی معشوق کا دیدار ہوتا ہے۔ اس مشاہدہ سے اس کا عشق اور بھی تیز ہو جاتا ہے، رفتہ رفتہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور عاشق ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ صرف عالمِ تحیر میں رہتا ہے۔ اس راہ میں محبت کے سات سو مقامات ہیں، پہلا یہ ہے کہ معشوق کی طرف سے جو بلا بھی نازل ہو اس کو صبر و سکون سے عاشق برداشت کرے،

محبت کی کوئی غایت نہیں، عاشق اپنے تمام اعضا کے ساتھ محبت معشوق میں مستغرق رہتا ہے، اور اپنی آنکھوں سے صرف معشوق کو دیکھتا ہے، اپنے کانوں سے صرف معشوق کی باتیں سنتا ہے، اپنے ہاتھ پاؤں کو صرف معشوق کے لیے حرکت دیتا ہے، اپنی زبان سے صرف معشوق کا ذکر کرتا ہے، اور اس راہ میں وہی صادق ہے جو ہر لمحہ معشوق کے ذکر یعنی ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے، ذکر یعنی عبادت الٰہی سے عشق کی تکمیل ہوتی ہے، عبادت الٰہی میں ظاہر اور باطن کا یکساں ہونا ضروری ہے، عبادت سے اسرار الٰہی معلوم ہوتے ہیں، مگر انکا ظاہر کرنا عشق کے منافی ہے (اسرار الاولیا ملفوظات حضرت فریدالدین گنج شکر ص ۴، ۶، ۸، ۴۹، ۵۱۔ بزم صوفیہ مرتبہ خاکسار ص ۱۸۰، ۱۷۹)

حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ کا تعلق بھی چشتیہ سلسلہ سے رہا، وہ بھی عشق کی بے پناہ قوت کے قائل تھے، ان سے ایک مثنوی عشقیہ منسوب ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

عشق کو بے بال و پر طیراں کند عشق کو در لامکاں جولاں کند

عشق کو تا چشم دل بینا کند عشق کو تا سینہ پر سودا کند

عشق کو تا تاج سلطانی نہد عشق کو ملکِ سلیمانی دہد

عشق کو تا عقل را زائل کند عشق کو تا عقل را حاصل کند

عشق کو تا جامِ مدہوشی دہد عشق باید تا فراموشی دہد

عشق وہ تا بے خبر سازد مرا بادہ کو بے یاد سر سازد مرا

عشق باید تا دہد جامِ شراب عشق سازد ساغرے آفتاب

وہ اپنے ایک مکتوب میں عشق، عاشق اور معشوق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عنایت شروع ہو جائے تو تم میں جذبہ پیدا ہونے لگے

اور تم کو تم سے دور کیا جائے تو گویا تم میں عشق کا آغاز اور تم پر حسن کا جلوہ ظاہر ہو گیا اور جب تم پر حسن کا مشاہدہ ہو جائے تو معشوق کو پہچانو اور عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ اور جب عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ گے تو اسی طرح کام کرو، معشوق کی سنت اور عاشق کے فریضہ کو قائم رکھو، اس وقت معشوق کو عاشق کے ذریعہ سے پہچان لوگے، اے برادر! معشوق کو تمہاری جیسی صورت میں پیدا کر کے تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے تاکہ براہ راست تم کو وہ دعوت دے .... عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے وجود کا ملک بنایا تاکہ اپنے حسن و جمال کو تمہارے آئینہ میں دیکھے اور تم کو محرم اسرار جانے، الانسان سری (انسان میرا بھید ہے) تمہاری شان میں آیا ہے، عاشق ہو جاؤ کہ حسن کو ہمیشہ دیکھو اور دنیا و عقبیٰ کو پہچانو، عقبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک ہے اور دنیا شیطان کی ملکیت ہے، دونوں میں معلوم کرو کہ تمہارے لیے کس کو پیدا کیا ہے (مزید تفصیل کے لیے دیکھو بزم صوفیہ، تیسرا ایڈیشن، ص ۲۹۸-۲۹۵)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ پر بھی عشق ہی کی حکمرانی رہی، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ رات کافی گذر جاتی تو وہ اپنے حجرہ کا دروازہ بند کر لیتے، پھر تنہائی میں کیا ہوتا یہ کسی کو خبر نہ ہوتی، صرف اتنا پتہ چلتا کہ وہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، تمام رات ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بیخودی و وارفتگی طاری رہتی جس کا اظہار حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی دن کے وقت ان کی زبان مبارک سے سنے جاتے،

عشقے ز تو دارم اے شمع چہ گل | دل داند من دانم و من دانم و دل
بارے بہ تماشائے من رشمع بیا | کز من دیکھے تماز واز دے دوئے

قطعہ

تنہا منم و شب و چراغے | مونس شدہ تا پگاہ روزم
کا ہش ز آہ سرد بکشم | گاہ از تفِ سینہ بر فروزم

ان کے اس قسم کے جذبات کی انتہا حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتی ہے، جو ان کی زبانی سنے گئے۔

آں روز مباد کہ تو بیزار شوم | یا با دیگرے دریں جہاں یار شوم
گر بر سر کوئے تو مرا دار کنند | من رقصاں کناں بر سرآں دار شوم

وہ بھی اپنے مرشد کی طرح اس کے قائل تھے کہ درویش اہل عشق ہوتے ہیں اور علماء اہل عقل۔ فرماتے ہیں کہ جب تک اللہ جل شانہ کی محبت قلب کے غلاف میں ہوتی ہے، گناہ کا صادر ہونا ممکن ہے، لیکن محبت جب قلب کے گرد و نواح میں آجاتی ہے، تو پھر گناہ صادر نہیں ہوتا، (افضل الفوائد، قلمی نسخہ دار المصنفین) پہلے ذکر آیا ہے کہ حضرت خواجہ نے سوز عشق پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ سینہ کی آہ سے دریا بھی خشک بیابان ہو سکتا ہے، جس کو خسرو کے شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

دریا ز آہ سینہ من خشک شد چنانکہ | ہرگز بہ چشم خویش نہ بیند کسے نے

(باقی)

حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سیمنار

(منعقدہ کابل (افغانستان)

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

گذشتہ قسط میں ذکر آیا تھا کہ سنائی کے دو مکتوب ایک ایسے خطی مجموعہ سے ملے جس کی کتابت ۵۴۳ھ میں ہوئی تھی، اور یہ مجموعہ دو عارفانہ تصانیف بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس پر مشتمل ہے، اول الذکر خطی مجموعہ برلن کے سرکاری کتاب خانے میں تھا، ۱۹۴۵ء میں ٹوبیگن یونیورسٹی کے کتاب خانے میں منتقل ہوا، زیر شمارہ MS Orient Fol 99 اور فہرست میں ج ۵، پر اس کا ذکر موجود ہے، اس میں ۲۷۶ ورق یعنی ۵۵۲ صفحے ہیں اور سنائی کے خطوط ورق ۲۷۲ سطر چہارم سے شروع ہوکر ۲۷۵ پر ختم ہوجاتے ہیں، ابھی بستان العارفین اور منتخب رونق المجالس کا جو ذکر آیا ہے ان کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر احمد رجائی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد دانشگاہ تہران کی طرف سے (انتشارات تہران ۱۳۴۷) ایک ہی ساتھ چھپ گئی ہیں، مگر سنائی کے خطوط مطبوعہ نسخہ میں شامل نہیں، استاد ایرج افشار (دانش گاہ ایران) کے توسط سے سنائی کے خطوط کا عکس راقم حروف کو حاصل ہوگیا ہے،

اگرچہ بنیادی طور پر مکاتیب سنائی میں ان خطوط سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ دونوں خط مطبوعہ نسخے میں موجود ہیں، لیکن ان کی اہمیت کئی اور اعتبار سے ہے۔

(۱) یہ دونوں خط سنائی کے کلام کے سب سے قدیم مکتوبے ہیں، کلیاتِ سنائی کا نسخہ، کابل قیاساً قرنِ ششم کے اواسط کا قرار دیا گیا ہے، سنائی کے خطوط کا یہ نسخہ بحالت موجودہ نسخہ، کلیات سنائی سے اقدم سمجھنا چاہئے۔

(۲) سنائی کے یہ دونوں خط ابو القاسم درگزینی وزیر سنجر کے نام ہیں اور دونوں میں سنائی نے وزیر کے پاس جانے سے اعراض کیا ہے، اس لئے ان کو ایک ہی ساتھ آنا چاہئے، مکاتیبِ سنائی میں ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہوگیا ہے، یہ صحیح نہیں۔

(۳) مجموعے کے اس نسخہ سے سنائی کی تاریخ وفات پر روشنی پڑتی ہے، اس میں خطوط کے شروع میں "سنائی رحمۃ اللہ علیہ" کا فقرہ ملتا ہے اور آخر میں سنہ کتابت ۵۴۳، چونکہ رحمۃ اللہ علیہ دعائیہ کلمہ ہے جو صرف متوفی اشخاص کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ سنائی کی وفات اواخر ربیع الاول ۵۴۳ سے پہلے ہوچکی تھی، استاد عبد الحئی حبیبی اور چند دوسرے محققین کے نزدیک سنائی کی وفات ۵۴۵ ہجری میں ہوئی، استاد حبیبی نے اسی سیمنار میں سنائی کی وفات کی تحقیق پر ایک تفصیلی مقالہ پیش کیا ہے، جس میں انھوں نے اس بات پر بڑے دلائل پیش کئے ہیں کہ حکیم کی وفات کی تاریخ ۵۴۵ ہجری ہے، لیکن یہ سارے دلائل بڑی حد تک قیاسی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خطی مجموعے میں مندرج تاریخ یعنی ربیع الاول ۵۴۳ ہجری زیادہ قابلِ قبول ہے اس لئے اس مجموعے کا کاتب سنائی سے متاثر تھا، ورنہ دو عارفانہ تالیف کے ایک مجموعے میں ان کا شمول بے معنی تھا، اور اس کاتب کے نزدیک سنائی ۵۴۳ھ میں فوت ہوچکے تھے، اتنی قدیم شہادت یقیناً کافی وقیع ہے، اور بحالت موجودہ اسی کو تسلیم

کرنا چاہیئے۔

سنائی کے قدیم نسخۂ کلیات اشعار میں حکیم کی وفات ۵۲۹ ہجری بتائی گئی اور بعض محققین کے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے، اسی قیاس کی ایک گونہ تائید تودربانت خطی مجموعے سے بھی ہوتی ہے،

(۴) مکاتیب سنائی میں متعدد مقامات پر متن مشکوک ہے، حالیہ مطالعے میں بعض اور متون ملے، ان کے باہمی مقابلے سے بعض شکوک رفع ہو گئے ہیں، نیز کچھ نئے مواد کی روشنی میں بعض توضیحی امور کی تصدیق و توثیق ہو گئی ہے، اور چند عربی اشعار و فقرات کے ماخذ کا بھی پتہ چل گیا ہے، غرض ان امور کی روشنی میں مکاتیب سنائی کا تیسرا ایڈیشن تیار ہے انشاء اللہ طباعت کے معقول ذرایع کے حصول کے بعد اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

اسی موقع پر چند اور کتابیں تقسیم ہوئیں، جن میں سے بعض ہمارے نقطۂ نظر سے کافی قابلِ توجہ ہیں، مثلاً محمود شیرانی کی مشہور کتاب "فردوسی پر چار مقالے" استاد عبدالحی حبیبی کے قلم سے فارسی میں ترجمہ ہو گئی ہے، یہ کتاب فردوسی پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیتی ہے، اور باوجود اس کے کہ فردوسی پر سینکڑوں مقالے اور رسالے لکھے گیے لیکن جن موضوعات پر شیرانی نے قلم اٹھایا ہے، اس پر اب تک کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا، اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر استاد سعید نفیسی اس کے ترجمے کا منصوبہ ۱۹۵۰ سے قبل بنا چکے تھے، مگر یہ کام پورا نہ ہو سکا، خوشی کی بات ہے کہ نفیسی کی یہ دیرینہ آرزو استاد حبیبی جیسے محقق و مورخ کے ذریعے پوری ہوئی، مترجم کا مقدمہ بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے،

اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے محقق کی تحقیقی صلاحیت کا اعتراف ہے،

آثار اردو اقبال کے نام سے عبدالہادی دادی نے ۱۳۵۵ میں (جلد اول) شائع کی ہے اس میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ ہے، اس میں ان کی تین کتابوں یعنی اقبال نامہ جلد اول و دوم، ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز کا تعارف ہے اگرچہ یہ تعارف فارسی دانوں کے لئے مفید ہے، لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کا اردو کلام فارسی میں منتقل ہو، جس سے ان سے استفادہ عام ہو۔

آج سے تقریباً ۴۲ سال قبل افغانستان کے جید علما کی ایک ہیئت کے تحت نظر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے ترجمہ و تفسیر قرآن اور مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کے موضح القرآن کا ترجمہ فارسی میں عمل میں آیا، جو چھ جلدوں میں طبع ہوا، اور ہر ایک جلد کی تین ہزار جلدیں چھپیں، کچھ دنوں میں مطبوعہ نسخہ نایاب ہو گیا۔ اور کتاب کی مانگ بڑھی تو ۱۳۴۵ شمسی میں دوبارہ چھ جلدوں میں یہ تفسیر چھپی، اور اس بار انکی بائیس ہزار دو سو جلدیں تیار ہوئیں اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس تفسیر کی اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستان کے علما کی تحریرات کتنی بلند پایہ ہیں۔

اب میں سمینار میں پیش کئے گئے مضامین کی فہرست درج کرتا ہوں، اور جیسا عرض ہو چکا ہے کہ اکثر مقالے فارسی میں تھے اور بحث و گفتگو صرف فارسی میں ہوتی تھی —

۱. غزلہاے عرفانی سنائی و اثرات آں در دیوانِ شمس تبریز — دکتور قیام الدین راعی (افغانستان)

۲. ذکر چند نکتہ دستوری و لغوی در حدیقہ، — پروفیسر محمد آصف نکہت (افغانستان)

۳. حکیم سنائی و رمز لفظ عارفانه — پروفیسر رابرٹ معین الدین ٹامسن (امریکہ)

۴. بعضے اشعار ناشناخته شده سنائی — پروفیسر نذیر احمد (ہندوستان)

۵. تحقیق بر تاریخ وفات سنائی — استاد عبدالحی حبیبی (افغانستان)

۶. تاریخ وفات سنائی — ڈاکٹر بو اوتاس (سویڈن)

۷. آرام گاه پدر و مادر و فرزندانِ سنائی — دکتور امیر محمد اثیر (افغانستان)

۸. تجلی برخی اشعار سنائی در آثار مولانا روم — پروفیسر مائل ہروی (")

۹. عشق در غزلهای سنائی — پروفیسر سید محمد رضوان حسین (ہندوستان)

۱۰. انعکاس عصر و محیط در شعر سنائی — پروفیسر عبدالله خدمتگار (افغانستان)

۱۱. مزار خواجه اسماعیل شنیزی (ممدوح سنائی) — آقای احسان الله ارین زی (")

۱۲. علم نفس و علم نجوم در سیر العباد — پروفیسر کریسٹوف بورگل (انگلستان)

۱۳. خطاب به باد در آغاز سیر العباد — دکتور اسکار چیا (اٹلی)

۱۴. از سنائی تا مولانا روم تا اقبال — پروفیسر مس شیمل (جرمنی)

۱۵. نظری پیرامون تحریمة القلم سنائی — استاد غلام فاروق نیلاب رحیمی (افغانستان)

۱۶. بحثے درباره تاثیر حکیم سنائی بر ادبیاتِ کلاسیک ترک — دکتور عبدالقادر قره خان (استنبول. ترکی)

۱۷. معنی عقل از نگاه حکیم سنائی — استاد احمد صدیق حیا (افغانستان)

۱۸. مفاهیم تربیتی در آثار سنائی — دکتور محمد حسین راضی (افغانستان)

۱۹. جنبهای توصیفی در اشعار سنائی — استاد عبدالقیوم (افغانستان)

۲۰. تاثیر دو بیت حدیقه در مجلس سماع حضرت نظام الدین اولیاء — استاد محمد صالح پروتا (")

۲۱. هستی شناسی از ابن سینا تا سنائی و حکمای امروز — استاد عبدالله سمندر غوریانی (افغانستان)

۲۲. سوابق خودی علامهٔ اقبال در کلام سنائی — استاد محمد دین ژواک (")

۲۳. ارادت و علاقهٔ من بحکیم سنائی. — استاد محمد ابراهیم خلیل (")

۲۴. نکاتے چند دربارهٔ شاعر و حکیم سنائی — دکتور زکی عبدالحسین الصراف (عراق بغداد)

۲۵. ضرورت بازیافتن متن اصلی دیوان حکیم سنائی — استاد غلام غوث عالمی (افغانستان)

۲۶. ادب پشتو و حکیم سنائی — زلمی هیوادمل (؟)

۲۷. حکیم سنائی بنیادگذار طنز در شعر دری (فارسی) — استاد جلال نورانی (افغانستان)

۲۸. ارتباط سنائی با رجال معاصرے — دکتور محمد افضل بنوال (افغانستان)

۲۹. پشتو و حکیم سنائی — دکتور حبیب الله رفیع (")

۳۰. عشق از نگاه حکیم سنائی و مولانای روم — استاد محمد حسین یمین (")

۳۱. سیر تصوف در افغانستان (معرفی کتاب) — دکتور عبدالحکیم طبیبی (")

۳۲. سنائی و اقبال — پروفیسر صوفی غلام مصطفی تبسم (پاکستان)

۳۳. شریعت از نگاه سنائی — مولانا گلاب بشار (")

۳۴. (Hakim Sanai and Historical Milieu two dimensional - Study.) — Dr. V.C. Sriwastawa Indian prof. at Kabul University

مقالات کے عنوانات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان میں کافی تنوع تھا۔
لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ سنائی کی زندگی کا کوئی ایسا خاص ماخذ سامنے نہیں آیا جس سے بعض اختلاف آرا مسئلے پر تشفی بخش روشنی پڑتی، نسخۂ کابل کی اشاعت اس حد تک سودمند ہوئی کہ اس کے مقدمے میں وفات کی تاریخ ۵۲۹ ہجری واضح درج ہے، دوسری خاص بات یہ معلوم ہوئی کہ حدیقۂ سنائی کا مقدمہ خود سنائی ہی کے قلم کا ہے، جو بعض جزوی تبدیلی سے کسی مجہول شخص محمد بن علی الرفاء نے اپنی طرف منسوب کرلیا ہے۔

سنائی کے کلام کا تعین بڑا متنازع فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے، بعض مثنویاں ان کی طرف غلط منسوب ہیں، صرف چار مثنویاں یعنی حدیقہ، سیر العباد، کارنامۂ بلخ اور تحریمۃ القلم یقینی طور پر سنائی کی ہیں، بقیہ مشکوک اور غلط ہیں، لیکن اس موضوع پر کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی، تذکروں میں ستہ سنائی کا ذکر تکرار سے آتا ہے، یہ بات خصوصیت سے بحث طلب ہے کہ ستہ میں کون کون مثنویاں شامل ہیں اور ان کے شمول کی بنیاد کیا ہے، سنائی کا دیوان بھی رطب و یابس سے پاک نہیں، یہ اہم موضوع شرکائے مجلس کے لئے مخصوص موضوع گفت گو نہ بن سکا۔

سنائی کے نثری کلام میں ان کے مکاتیب ہیں جو ۱۷ سال قبل شائع ہوچکے ہیں، اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی،

سنائی کے فکر و فن پر ایسا کوئی مقالہ پیش نہیں ہوا جس سے اندازہ ہوتا کہ ان کی شاعرانہ عظمت کے راز کیا ہیں، اس موضوع کی وسعت ضخیم کتاب کی متقاضی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس پر مطلق توجہ نہیں ہوئی۔

سنائی کی اخلاقی اور عارفانہ شاعری سے صرف فارسی شعراء ہی متاثر نہیں ہوئے

بلکہ اجتماع کا ہر طبقہ ان سے مستفید ہوا ہے، راقم کا خیال ہے کہ اخلاقی شاعری کے اعتبار سے فارسی کا کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہیں، ان کے فن کا کمال سمجھئے کہ انھوں نے قصیدہ جیسی صنف کو اس خاص کام کے لئے مخصوص کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود معاصرین میں ان کے اپنے قصائد کافی مقبول ہوئے، راقم نے حال ہی میں اسی موضوع پر ایک طویل بحث مجلہ علوم اسلامی علی گڑھ میں کی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشف الاسرار میں جو سنائی کی زندگی ہی میں مرتب ہوچکی تھی، قصیدے کے کئی سو اخلاقی اور عارفانہ اشعار سے استدلال ہوا ہے، مقصد یہ ہے کہ سنائی کی شاعری کا یہ رخ نہایت توجہ طلب ہے، مگر سیمینار میں اس پر قرار واقعی توجہ نہیں دی گئی۔

سیمینار کے دوران ۲۱ اکتوبر بروز جمعہ ہم لوگوں کو غزنین کی سیاحت کرائی گئی، غزنین کابل سے مغرب میں کار سے ڈھائی گھنٹہ کی مسافت پر ہے، یہ شہر جو کئی سو سال تک غزنویوں کا دار الخلافہ رہا، اور اپنی شان و شوکت کے لئے شہرۂ آفاق تھا، اب ایک قصبے کی صورت میں باقی ہے اور ایک ولایت کا صدر مقام ہے، مگر یہاں کی شاندار عمارتوں کا نام و نشان تک باقی نہیں، اور باقی رہتا کیونکر، اس لئے کہ سب سے پہلے علاء الدین غوری نے بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ میں ۵۴۷ھ میں اس کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، اور اسی کی وجہ سے وہ تاریخ میں علاء الدین جہاں سوز کے نام سے مشہور ہے، پھر منگول کے حملے میں اس کی بچی کھچی عظمت کا نام و نشان جاتا رہا۔

بہرحال عمارتیں تو باقی نہیں، البتہ کہیں کہیں کچھ نشان باقی رہ گئے ہیں، مثلاً دو منارے ہیں، ان میں سے ایک سے علاء الدولہ مسعود بن ابراہیم (۴۹۲، ۵۰۸) اور دوسرا بہرام شاہ بن مسعود غزنوی (۵۰۹ - ۵۴۷) کا ہے، دونوں کی دیواروں کی

کتبات خط کوفی میں ہے، مسعود شاہ کے محل کی دیوار پر فارسی ابیات کوفی خط میں ہیں، جو کوفی خط میں فارسی کے قدیم ترین نمونے قرار دئے جاسکتے ہیں، یہ کتبے اٹلی باستان شناسوں کی توجہ سے کشف ہوئے اور سنہ ۱۹۶۱ء میں چھپ چکے ہیں۔

غزنین میں قدیم عمارتیں تو نہیں ملتیں لیکن قدیم محرابیں اور قدیم قبریں کثرت سے موجود ہیں، اور ایسی قبروں کی بھی کمی نہیں جو کتبات کی حامل ہیں، البتہ بادشاہوں کی قبریں زیادہ باقی نہیں رہی ہیں، صرف ناصر الدین سبکتگین اور سلطان محمود کی قبریں باقی ہیں، ان دونوں قبروں پر کتبات کوفی خط میں پائے جاتے ہیں، سلطان محمود کی قبر پر کافی کتبے ہیں، یہ سب کے سب چھپ چکے ہیں، استاد عبدالحی حبیبی نے اپنے رسالہ تاریخ خط و نوشتہ ہائے کہن میں ان سے کافی استفادہ کیا ہے، سینکڑوں مشایخ اور دوسرے ممتاز شہریوں کی قبروں سے غزنین بھرا پڑا ہے، اس سلسلے کے بعض مطالعے بھی سامنے آچکے ہیں، راقم حروف کے پیش نظر ایک کتابچہ ریاض الالواح تالیف شیخ محمد رضا ہے جو سنہ ۱۹۶۷ء میں کابل میں چھپا تھا، دوسرا کتابچہ بنام مقامات تاریخی غزنہ سرور ہمایوں کا ہے، اور سنائی کے سیمینار کے موقع پر شائع ہوا، ان مزارات میں جو ہمارے لحاظ سے قابل ذکر ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ مزار حکیم سنائی، شہر غزنین کے جنوب غرب میں ایک قبرستان میں ان کا روضہ ہے، جس میں متعدد قبریں ہیں، حکیم کی قبر پر کئی کتبات ہیں، لیکن قدیم کتبے تاریخ سے عاری ہیں،

۲۔ حکیم سنائی کے مزار کے پاس رمضان بن یوسف کی قبر ہے، جس کی لوحِ سنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۵۰۹ھ میں یعنی حکیم سنائی سے قبل فوت ہوئے، یہ قبر سلطان روم کے نام سے مشہور ہے، یہ کتبہ بہت قدیم ہے۔

۳۔ مزار پسر حکیم سنائی، یہ قبر حکیم کی قبر سے تقریباً ڈیڑھ سو گز مشرق میں اس راہ پر واقع ہے

جو حضرت شمس العارفین کے مزار کو جاتی ہے، اس پر جلی خط میں بسم اللہ الرحمن الرحیم، کل نفس ذائقۃ الموت درج ہے، اور لوح سنگ کے دوسری طرف "الشیخ الجلیل مظفر الحسان العزیز ابن السنائی" موجود ہے، اس کتبے کی تحریر سنائی کے کتبے کے مشابہ ہے، سنائی کے لڑکے کا نام مظفر الحسان العزیز معلوم ہوتا ہے، اس مزار کی تحقیق دکتور امیر محمد اثیر نے کی ہے، البتہ اس کتبے کا ذکر ریاض الالواح میں ہوا ہے۔

۴۔ لوح سنگ ابو محمد ابوبکر بلخی، یہ لوح مزار سنائی کے پہلو میں ہے، جس پر یہ تحریر ہے:

ہذا المنبر للشیخ العزیز الشہید الزاہد ابی محمد ابی بکر البلخی رحمۃ اللہ علیہ۔ خدائے عزوجل بر آں بندہ رحمت کناد کہ عم حکیم را بدعا یاد آرد۔

مولف ریاض الالواح نے لکھا ہے کہ خواجہ ابوبکر بلخی وہی ہیں جو خواجہ بلغار کے نام سے مشہور ہیں، جن کا مزار دامنِ کوہ میں ہے، ریاض کے الفاظ یہ ہیں:

ازیں عبارت چناں مفہوم می گردد کہ ایں سنگ یکے از احجار منبر بودہ کہ عم حکیم سنائی از برائے خواجہ ابوبکر بلخی ساختہ، و مدفن خواجہ ابوبکر در نزدیک روضہ سلطان بدامنِ کوہ واقع است، واکنوں بہ زیارت خواجہ بلغار شہرت دارد۔ (ص ۶۸)

داراشکوہ نے غزنین میں خواجہ بلغار کے مزار کی زیارت کی تھی، اور اس کو بڑا پُرفیض قرار دیا ہے، نیز سفینۃ الاولیاء سے واضح ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں کسی امیر جلال الدین محمود کی کوشش سے اس جگہ ایک بقعہ کی تعمیر سنہ ۹۶۴ھ میں ہوئی اور تاریخ تعمیر اس قطعے سے معلوم ہوتی ہے:

ایں منزل دلکشائے گردوں فسحت　　کز سوز و صفا آمدہ رشکِ جنت
برلوحِ زمانہ از پے تاریخش　　بنوشتہ فلک منزلِ کیواں رفعت

داراشکوہ نے عمارت کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اتنا لکھا ہے کہ "مزار ایشاں لوح ندارد، لکن در پہلوے قبر مبارک سنگے سفید منصوب است و در آں سنگ ایں عبارت منقوش است"۔ یہ عبارت وہی ہے جس میں اس بقعۂ خیر کی تعمیر کا ذکر ہے کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے ایک امیر جلال الدین محمود کے توسط سے ۹۶۴ھ میں یہ وجود میں آیا، مولف ریاض الالواح بھی قبر کا ذکر کرتے ہیں، اس وقت بقعہ موجود نہ تھا۔

۵۔ قبر فرخی شاعر، دکتور امیر محمد اشیر کی روایت یہ ہے کہ حکیم سنائی کے حوالی میں پانچویں قبر فرخی شاعر کی ہے، لیکن اس پر کوئی لوحِ سنگ وغیرہ نہیں ہے، دکتور مذکور غزنین کے باشندے ہیں اور انھوں نے لوگوں کی زبانی یہی روایت سنی ہے۔

۶۔ محراب بقعۂ سلطان مسعود بن ابراہیم (م: ۵۰۹) کوفی میں یہ عبارت منقش ہے، والنصر السلطان الاعظم ابا سعید مسعود خلد اللہ ملکہ مع آیۃ الکرسی۔

۷۔ محراب سلطان مودود بن سلطان مسعود (م) کوفی خط میں یہ تحریر ہے، امر الامیر السید الملک المؤید شہاب الدولہ وقطب الملۃ وفخر الامۃ ابوالفتح مودود بن مسعود اطال اللہ عمرہ، حررہ ہذہ من شہور سنۃ ستۃ وثلثین و اربعمائۃ (۴۳۶ھ)

۸۔ محراب مسجد شہاب الدین غوری، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

بنام ہذا المسجد المبارک فی دولۃ السلطان الاعظم المعظم معز الدنیا والدین ابوالمظفر محمد بن سام خلیفۃ اللہ امیر المومنین المنتصف من شہر اللہ المبارک سنۃ اربع وتسعون وخمسمائۃ، (۵۹۴ھ)

۹۔ قبر شیخ سلیمان بن احمد الصغانی سنہ ۵۰۶ھ

۱۰۔ قبر محمد بن بدر الدین صدر القضاۃ زین الملۃ والدین صغانی۔

۱۱۔ قبر شیخ ابوالفضل محمد بن سلیمان بن احمد صغانی۔

۱۲۔ قبر عبدالرحمٰن الصغانی سنۃ تسع واربعین وسبع مائۃ۔

۱۳۔ مرقد اقضی القضاۃ ناصر المذہب النعمانیۃ جلال الملۃ والدین عبدالرحمٰن بن ملک القضاۃ جمال الدولہ والدین سلیمان بن احمد الصغانی۔

۱۴۔ روضۃ شیخ اقضی القضاۃ ابی نصر احمد بن محمد بن سلیمان۔ سنائی کے ممدوح تھے، انھوں نے حدیقہ میں ان کی تعریف کی ہے:

علم او ہمچو آب شوینده   نام او ہمچو باد پوینده

(اشعار کلیات ص ۱۲۲)

۱۵۔ قبر شجاع الدین عمر بن محمد بن احمد صغانی۔

۱۶۔ قبر سید ابوجعفر محمد بن علی النخاص تاریخ شہر اللہ المبارک رمضان سنۃ ثلاث وخمس مائۃ۔

۱۷۔ قبر سہل بن محمد الباغبان الغزنوی، کان وفاتہ من شہر ربیع الآخر سنۃ سبع واربعین واربعمائۃ۔

۱۸۔ قبر الشیخ الجلیل سید ابوالفضل محمد بن علی طوسی ۹ رمضان سنۃ سبعین واربعمائۃ۔

۱۹۔ قبر شیخ عثمان مشہور بہ ارباہا۔ شیخ مذکور ابوالحسن علی ہجویری جلابی صاحب کشف المحجوب کے پدر بزرگوار تھے، ہجویر اور جلاب غزنین کے دو محلے تھے۔

۲۰۔ قبر الشیخ الاجل محمد سرزی، ان کی وفات لوحِ قبر کے اعتبار سے جمعہ ۲۷ رجادی الآخر ۵۹۷ھ میں ہوئی۔

۲۱۔ شیخ احمد بن محمد حدادی، یہ علماء و نقباء کا مشہور خاندان تھا، غالباً اسی

خاندان کے دو قاضی یوسف بن احمد حدادی اور ابو المعالی احمد بن یوسف بن حدادی شالنجی غزنوی سنائی کے اہم ممدوح تھے، حکیم نے ابو المعالی احمد کی مدح حدیقہ اور قصائد میں کی ہے، اور ایک طویل خط ان کے نام لکھا جو ان کے تمام مکتوبات میں سب سے زیادہ عالمانہ ہے، ہمایوں سرور نے ان دونوں مشایخ کی قبر قریہ شالیز میں بتائی ہے، لیکن بقول مؤلف ریاض الالواح حکیم سنائی کے روضہ کے جنوب شرق میں امام احمد حدادی کی قبر ہے، مگر اس قبر پہ دو لوح ہیں، ایک کا کتبہ یہ ہے: ابی بکر محمد بن شیخ الامام احمد بن محمد الحدادی رضی اللہ عنہما۔ دوسرا کتبہ یہ ہے: کل نفس ذائقۃ الموت، والینا ترجعون، اللھم اغفر وارحم محمود العامر بن حداد بن احمد بن محمد۔

ابو نصر احمد بن محمد حدادی کی قبر کے قریب پتھر کے کچھ ٹکڑے ہیں، ان میں کچھ تحریر ہے، جس کے آخر میں یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں:

مجلسا لذکر راحۃ القلوب الامام الزاہد ابی نصر احمد بن محمد حدادی رحمۃ اللہ رضی اللہ عنہما۔

۲۲۔ قبر سید حسن غزنوی، شہر غزنین کے شرق میں شہر سے متصل اس شاعر شہیر کی قبر بتائی جاتی ہے، مگر یہ قبر کتبے سے عاری ہے۔

۲۳۔ قبر بیرونی، محمود غزنوی کے دربار کے زبردست ریاضی داں اور منجم ابوریحان بیرونی کی قبر شہر سے مشرق ایک احاطے میں ایک پرانے قبرستان میں بتائی جاتی ہے، اس پر ایک کتبہ ہے جو بحالت موجودہ پڑھنے میں نہیں آتا، لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ اس پر بیرونی کا نام درج ہے، اس قبر کی زیارت ہم لوگوں نے کی تھی۔

۲۴۔ آرام گاہ اسماعیل شنیزی، جن کی مدح میں سنائی کا ایک قطعہ دیوان میں ہے

اور جن کے نام سنائی کا ایک خط ہے، غزنین سے کچھ دور شنیز نام کے گاؤں میں موجود ہے، قبر پر ایک لوحِ سنگ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۷۲ھ میں یہ قبر تعمیر ہوئی تھی، کتبے میں سنائی کے قطعہ کا پہلا شعر درج ہے:

علم و عمل خواجہ اسماعیل شنیزی　　　مارا ز بچیزی برسانید بچیزی

محمود غزنوی کے مزار سے چند فرلانگ پر شاہراہ کے دوسری طرف ایک ٹیلے پر گوتم بدھ کا مٹی کا عظیم مجسمہ دیکھنے میں آیا، اس کے قریب ہی استوپا بھی کشف ہوا ہے، اس مجسمے سے کچھ پہلے ٹیلے ہی پر ایک مجسمہ ہے جس میں ایک آدمی بھینسے کو ذبح کر رہا ہے۔

بہر حال غزنین عجیب تاریخی مقام ہے، اور اگرچہ پرانی عمارتیں باقی نہیں رہ گئی ہیں، لیکن اس کی عظمت کے ٹوٹے پھوٹے نشان ہزاروں کی تعداد میں کتبات کی شکل میں موجود ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کی بازیافت کی صحیح کوشش نہیں ہوئی، در اصل ان تاریخی نشانات کے تنقیدی مطالعہ کے بغیر غزنین کی تمدنی وسیاسی تاریخ نامکمل رہے گی۔

ہم چند گھنٹے غزنین میں رہے، حالانکہ وہاں کے تاریخی امور کی جانچ پڑتال کے لئے مہینے ناکافی ہیں، بہر حال اس مختصر سی سیاحت سے غزنوی سلاطین کے جاہ و جلال کا ایک ادھورا سا نقشہ سامنے آیا، ساتھ ہی عبرت کا زبردست احساس دل پر ہوا، شام کو ہم لوگ واپس کابل آگئے، اور دوسرے روز سے سمینار کی باقیماندہ کارروائی شروع ہوئی۔

سمینار کے خاتمے پر میری درخواست پر میرے لئے بلخ کی سیاحت کا انتظام

کیا گیا، بلخ کابل سے شمال میں کار سے تقریباً سات آٹھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے، میں ۲۴ر اکتوبر کو صبح وزارتِ اطلاعات و کلتور کے ایک نمایندہ کے ساتھ کابل سے روانہ ہوا، شروع کے چار پانچ گھنٹے موسم کافی خوشگوار تھا، پہاڑ کی بلندیوں اور وادی کی گہرائیوں سے ہوتے ہوئے چلے جارہے تھے، جگہ جگہ پھلوں کے باغات اور روئی کے پودوں سے بھرے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت عجب خوشنما منظر پیش کر رہے تھے، کہیں کہیں دھان کے کھلیان بھی نظر آجاتے، پہاڑ کے دامن میں جب کوئی مختصر سی آبادی نظر آتی تو اس سے انسان اپنے کو ایک دوسرے عالم میں محسوس کرنے لگتا، غرض چلے جارہے تھے کہ یکایک موسم بدلا، ہلکی ہلکی برف پڑنی شروع ہوئی، تھوڑی ہی دیر میں برف بڑی شدت سے پڑنے لگی، ساری وادی اور پہاڑ برف کی سفید چادر میں ملبوس نظر آنے لگے، سڑک پر بھی کافی برف جمی ہوئی تھی، میرا کار ڈرائیور کافی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ چلتا جارہا تھا، آگے چل کر برف کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ ہم دو ڈھائی بجے کے قریب سمنگان پہونچے، یہ ایک چھوٹا سا تاریخی شہر ہے، یہیں کے بادشاہ کی بیٹی تہمینہ سے رستم نے شادی کی تھی، یہی شاہزادی سہراب کی ماں تھی۔ یہاں شاہراہ ہی پر شہر سے باہر ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے جس میں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ غذا خراب تھی، میں نے بہت ہی تھوڑا کھایا تھا، لیکن میرا ہاضمہ بگڑ گیا، بعد نماز ظہر ہم وہاں سے آگے بڑھے، تھوڑی دیر بعد خلم کا تاریخی شہر آیا، بڑا پُر فضا مقام ہے، یہاں کے باغات نہایت سرسبز ہیں، یہاں ہم نہ رُکے، اور رود خلم پر جو رود آمو سے ملتی ہے، ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بڑھے، ساڑھے چار بجے کے بعد ہم مزار شریف پہونچے، یہی اس خطے کا سب سے بڑا شہر ہے،

اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں پر حضرت علیؓ کا روضہ بنا یا گیا ہے اور عام اعتقاد یہی ہے کہ آنجناب یہیں مدفون ہیں، روضہ نہایت خوبصورت بنا ہے، بلخ یہاں سے پون گھنٹے کی مسافت ہے، ہم لوگ وہاں پہونچ سکتے تھے، لیکن ہوٹل وغیرہ وہاں نہیں ہیں، قیام کی سہولت مزار شریف ہی میں ہے، چنانچہ شب کو یہیں قیام کرنے کا خیال ہوا، ہم لوگ کابل سے جلدی میں چلے تھے، یہاں کی وزارت اطلاعات و کلتور کے دفتر میں ہماری آمد کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے اچھے ہوٹل میں جگہ نہ ملی، مجبوراً مجھے ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا، رات نہایت سرد تھی، اس ہوٹل میں سردی سے بچنے کا معقول انتظام بھی نہ تھا، شام کو جب باہر نکلا تھا تو دیکھا مزار کے اردگرد بہت خوبصورت بازار ہے جو غیر ملکی سامان سے بھرا پڑا ہے، کپڑے کے ایک جواں سال دوکاندار کے استفسار پر جب میں نے حضرت علیؓ کے مزار شریف میں مدفون ہونے کو غیر محقق بتایا تو اس کو تعجب ہوا، بہرحال اسی بہانے اس شہر کی روز افزوں ترقی ہوئی اور آج یہ افغانستان کا سب سے زیادہ متبرک مقام خیال کیا جاتا ہے، میں نے عصر اور مغرب کی نمازیں روضہ کی مسجد میں ادا کیں، سردی کی زیادتی کی وجہ سے عشاء کی نماز میں شامل نہ ہو سکا، صبح ہم لوگ وزارت کلتور کے ایک نمایندے مقیم مزار شریف کے ساتھ بلخ روانہ ہوئے، اس نمایندے کا نام میں بھول گیا ہوں، بڑا ذہین اور تیز جوان تھا، جو اخبار "مزار شریف" سے بھی متعلق تھا، اس نے مزار شریف سے بلخ کے درمیان جو گاؤں تھے، سب کا نام لکھ کر دیا تھا مگر وہ کاغذ کہیں گم ہو گیا، بہرحال کوئی پون گھنٹہ میں ہم لوگ بلخ پہونچ گئے، اب یہ شہر بالکل اجڑ چکا ہے، محض ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے، مگر یہ خطہ ولایت بلخ کہلاتا ہے، والی بھی بلخ میں رہتا ہے، بلخ کی عظمت کا اندازہ صفی الدین واعظ بلخی کی کتاب "فضائلِ بلخ" سے جو سنہ ۶۱۰ھ میں مرتب ہوئی

لگایا جا سکتا ہے، اس کتاب میں دو جگہ لکھا ہے کہ اس شہر میں ۱۸۴۸ مساجد، ۴۰۰ کالج، (مدارس آبادان) نو سو بڑے مدرسے (دبیرستان معتبر) پندرہ سو مفتی، پانچ سو ادیب، پانچ سو حمام، چار سو گنبد یخدان، تین سو حوض عمومی ہے، آج وہاں کی پرانی یادگاروں میں صرف تین چار چیزیں باقی رہ گئی ہیں، مثلاً:

(۱) مزار عکاشہ، یہ شہر سے تقریباً دو کلومیٹر مشرق میں اجڑے ہوئے قلعے سے جنوب میں تقریباً سو گز پر ہوگا، مزار پر کتبات موجود ہیں۔

(۲) مسجد گنبد، غزنوی دور کی اس یادگار مسجد کا کچھ حصہ شہر سے جنوب میں پایا جاتا ہے۔

(۳) گنبد خواجہ پارسا جو ۸۶۷ھ میں تعمیر ہوا تھا، اسی کے حوالی قبر میں بعض اہم شخصیات دفن ہیں جن کی فی الحال کوئی تفصیل میرے پاس نہیں۔

(۴) قلعہ، شہر سے تقریباً ۱½ کلومیٹر مشرق میں اجڑی ہوئی حالت میں موجود ہے، اس کے اوپر ہم لوگ گئے تو شمال سے ایسی سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی کہ ہر آن گر پڑنے کا اندیشہ تھا۔

قلعہ سے کچھ قبل چند درختوں کے جھنڈ میں ایک قبر ہے جو کسی قصاب کی بتائی جاتی ہے، یہاں میلہ لگتا ہے، یہ مقام دانتوں کے درد میں بڑا پُر تاثیر بتایا جاتا ہے، جس کے درد ہوتا ہے وہ ایک کیل درخت میں گاڑ دیتا ہے، یہی مراد مانگنے کا طریقہ ہے، وہاں کے درخت جڑ سے تنے کے اوپر تک کیلوں سے اتنے پُر ہیں کہ ان کو کیلوں ہی کا درخت کہنا چاہئے۔

بلخ میں کوئی چیز دیکھنے کی نہیں، ایک طویل و عریض مسطّح میدان ہے جو میلوں میں پھیلا ہے، زمین نہایت سر سبز ہے، خاص کاشت روئی کی ہوتی ہے، اکتوبر میں روئی کے

درخت پھولے ہوئے تھے، یہاں پر ایک سوتی مل ہے جو موٹے کپڑے بناتی ہے روئی کے اور بھی کارخانے ہیں۔

دوپہر تک ہم مزار شریف واپس آ گئے، یہاں ایک کتب خانہ قلمی کتابوں کا ہے جو یہاں کے میوزیم کا ایک حصہ ہے، کتاب خانے میں بعض خطی کتابیں میری دلچسپی کی تھیں، ان کی مختصر سی یادداشت بھی تیار کر لی تھی، مگر وہ دوسرے کاغذات میں مل گئی، اور وہ اس وقت تک مجھے مل نہیں سکی ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد ہم لوگ کابل روانہ ہوئے، مزار شریف کا نمایندہ ساتھ نہ تھا، البتہ کابل کا نمایندہ ساتھ ہی واپس ہو رہا تھا، ہر افغانی کی طرح اس کو مزار شریف سے بڑا لگاؤ تھا، واپسی میں مجھ سے کہا کہ میری پیدائش مزار شریف میں ہوئی ہے، اس لئے مجھے اس سے بہت زیادہ تعلق خاطر ہے، ہم لوگ رات میں ۹ بجے کے بعد کابل پہونچے اور سیدھے کابل ہوٹل گئے، کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ صبح میری جگہ ہوائی جہاز میں مخصوص ہو چکی ہے، چنانچہ وہی کارمند وزارت بہت صبح آ گئے، سامان درست کرنے میں میری مدد کی اور کار سے ایر پورٹ پہونچا دیا، ایر پورٹ پر ڈاکٹر شمیم صاحب اور ڈاکٹر تھڈانی صاحب میری "خدا حافظی" کے لئے تشریف لائے، غرض ان حضرات سے رخصت ہو کر افغان ایر سے دہلی آیا اور شام کی گاڑی سے اسی روز یعنی ۲۶ر اکتوبر کو علی گڑھ پہونچ گیا، واپسی پر سمینار سے متعلق ایک مختصر گزارش ICCR کو پیش کر دی، کچھ دن گزرنے پر سفارت ہند کی طرف سے ICCR ہی کے توسط سے ایک بڑا پلندہ

کانفرنس سے متعلق کاغذات کا ملا، کچھ عرصے بعد مکاتیب سنائی طبع کابل کی سو جلدیں سفارت ہند کے توسط سے ملیں، یہ جلدیں دانش گاہ کابل نے عنایت کی تھیں، میں انڈین کاونسل اور سفارت ہند کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

بزم تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اول کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، ان کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امرار، شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا، اب اس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے، تاکہ تمام مغل سلاطین اور ان کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق اور ان کے عہد کے اور ان کے دربار سے متوسل علمار و فضلار و شعرار کا تذکرہ اور ان کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہو گئے ہیں کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابل مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیر ترتیب ہے۔

قیمت ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

کی

وفات حسرت آیات پر تعزیتی خطوط

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم ۲۱ راگست ۱۹۷۹ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ اعظم گڈھ سے اپنے وطن تشریف لے گئے، وہاں پہونچتے ہی حسب ذیل خط لکھا جو ان کی زندگی کا آخری خط راقم کے نام تھا، اس کا چربہ درج ہے، "ص۔ع"

باسمہ تھولنڈی ضلع رائے بریلی

۲۲ اگست ۱۹۷۹ء

محب مکرم ۔ السلام علیکم

کل دو بجے یہاں پہونچا لُو کے اثر سے پیر پر ورم حد سے زیادہ ہو گیا اور بواسیر سے خون بہت نکلا، دو بجے دن سے صبح چار بجے تک ۱۴ گھنٹے مسلسل خون آتا رہا، چار بجے صبح سے بند ہے، اس کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی ہے، پانوں کے سرخ دانے بدستور ہیں، منہ بالکل اچھا ہو گیا تھا مگر کل ایک سیاہ چھالا اور ہو گیا آج کمی ہے،

صحت کی اس حالت میں رائے بریلی جانا غیر یقینی ہے، علی میاں کو اس صورت حال کی اطلاع دے دی ہے،

عید بعد لکھنؤ جاؤں گا تو رجسٹریشن وغیرہ کے بارہ میں کارروائی کروں گا۔

افتخار سے کتابت کے سلسلہ میں بھی گفتگو کروں گا،

خیام اور نقوش سلیمانی دونوں کے فوٹو کے سلسلہ میں بذریعہ خط ارکان سے منظوری مصارف کی لے لیجئے،

جب میں صبح پانچ بجے اعظم گڑھ کے بس اسٹینڈ پہونچا تو بس اسٹارٹ ہو رہی تھی طاہر صاحب اور حاجی صاحب اس سے شاہ گنج جا رہے تھے انھوں نے کنڈکٹر سے کہہ کر ذرا بس کو رکوایا تو جلدی جلدی ہم لوگ سوار ہو گئے اس میں رکشہ کا کرایہ دینا بھول گیا، مالی کو دو روپے دیئے تھے غالباً وہی اس نے رکشہ والوں کو دے دئیے ہوں گے طاہر صاحب کے ہاتھ تین روپے بھیج دئیے ہیں کہ مالی کو دے دیں گے آج وہ اعظم گڑھ آنے والے تھے۔

صدر جمہوریہ کے اعلان سے بڑی ہلچل ہے

احتشام صاحب اور رفقاء وغیرہ سے میرا حال بیان کر دیجئے فقط

عبدالسلام قدوائی

اُن کی وفات کی خبر سُن کر ہندوستان کے ہر گوشہ سے جو تعزیتی خطوط آئے اُن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:- "ص-ع"

باسمہ تعالیٰ

ندوۃ العلماء
۲۵ اگست ۷۹ء

برادر محترم و مکرم زید مجدہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا مکتوب ملا، میں کن لفظوں میں آپ سے تعزیت کروں کہ خود ہی تعزیت کا

مستحق ہوں، دار العلوم اور دار المصنفین دونوں بلکہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پورا حلقہ، عقیدت متاثر و قابلِ تعزیت ہے، ملاقات ہوگی تو زبانی باتیں ہوں گی آپ نے ارکان کو لکھنؤ میں جمع ہونے کا تار دیا ہے ضرورت تو اس کی بہت ہے لیکن یہ خیال رہے کہ ۷ ستمبر سے ۱۴ ستمبر تک میں لکھنؤ سے باہر رہوں گا، ۱۴ ستمبر کے بعد اگر یہ اجتماع ہو تو بہتر ہے، مولوی نعیم صدیقی صاحب سے میں نے زبانی کہا تھا لیکن شاید پوری بات ان کو یاد نہ رہی ہو، احتیاطاً لکھ رہا ہوں، اور کیا عرض کروں،

تن ہمہ داغ داغ شد — پنبہ کجا کجا نہم

والسلام

دعاگو ابوالحسن علی ندوی

(۲)

حبیب منزل - میرس روڈ علی گڈھ
۲۹ اگست ۷۹ء

جناب سید صاحب مکرم — السلام علیکم۔

مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کے انتقال پُر ملال کی خبر پرسوں اچانک سُنی، آج الجمعیۃ روزنامہ میں دیکھا کہ ۲۴ اگست یوم جمعہ مطابق ۳۰ رمضان مبارک بوقت سہ پہر اپنے وطن قصبہ تھولنڈی ضلع رائے بریلی میں انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، بہت افسوس ہے، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ، مولوی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، عالم سمجھدار، با اخلاق، منکسر مزاج، متواضع بزرگ تھے، آپ کو مولوی صاحب کے اعظم گڈھ آجانے سے تقویت تھی، آپ کے پاکستان کے طویل قیام کے دوران میں دار المصنفین

کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ، جگہ خالی ہوگئی، جانشین ملنا آسان نہیں،

خاکسار

عبیدالرحمٰن

(۳)

بھوپال

۲۶ اگست ۷۵ء

(بذریعہ تار) مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات سے انتہائی مغموم اور رنجیدہ ہوں۔

محمد عمران خاں

(۴)

ندوۃ المصنفین دہلی

یکم ستمبر   محبی و مکرمی جناب سید صاحب دام مجدہم

السلام علیکم

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی اچانک رحلت کی خبر سُن کر قلب پر چوٹ لگی، پہلے سے ان کی علالت کی خبر نہیں تھی، اور شاید علیل رہے بھی نہیں، افسوس دارالمصنفین ایک فاضل، مخلص اور بے لوث عالم دین اور بہت اچھے انشا پرداز سے محروم ہوگیا، مرحوم غیر معمولی خصوصیات اور کمالات کے امین تھے، پیکر اخلاق و انکسار، مجسم تواضع، ذہنی اعتبار سے نہایت متوازن، اپنے مسلک میں مضبوط، اور دوسرے مسلکوں کے لئے کشادہ دل، یہ ہمارے اندازوں کی غلطی تھی اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مرحوم ابھی بہت دنوں تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور از راہِ کرم تعزیت قبول فرمائیں، "عتیق الرحمٰن عثمانی"

(۵)

دفتر جماعت اسلامی ہند - دہلی

۶-۱۰-۹۹   برادرِ مکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

برادرم مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب کی وفات کی خبر مجھکو عید کے دن ملی، دل کو بڑا صدمہ ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور جملہ متعلقین اور احباب کو صبر جمیل کی توفیق دے،

مرحوم سے اُس دن آپ کے ساتھ ملاقات ہوئی تو ماشاء اللہ صحت مند تھے، اُن کا خلوص و محبت سے ملنا ابھی تک یاد ہے، کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے، اور اُس دن کی ان سے ہماری آخری ملاقات ہوگی،

ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے، آج وہ تو کل ہماری باری ہے، وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیابی کے ساتھ مراحلِ حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لئے روانہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوضِ کوثر پر اُس دن ملا دے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پائے گا، اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا،

والسلام   محمد یوسف

(۶)

محترمی! سلام مسنون

آج اخبار سنگم پٹنہ میں جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (علیہ الرحمۃ) کے انتقال کی خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون، دارالعلوم ندوہ کے لئے یہ تیر ازبر دست

حادثہ ہے، اور دارالمصنفین کے لئے بھی،

میں آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، اور اُن کے گھر کے لوگوں کو اور ان کے احباب مخلصین کو صبر و سکون عطا کرے، آمین!

ہماری رائے ہے کہ آپ لوگ مولانا عبد اللہ عباس ندوی سلمہٗ کو بلوالیں، یہ ماشاء اللہ جوان اور بلند ہمت آدمی ہیں، عربی زبان کے ماہر اور باصفت عالم ہیں، ندوہ کا کام بھی اچھا کریں گے اور دارالمصنفین کی خدمت بھی بہتر طریقہ سے انجام دیں گے،

امسال ہمارا ارادہ حج و زیارت کا ہے، ابھی جہاز کی تعیین نہیں ہوئی ہے اسلئے روانگی کا پروگرام بھی نہیں بنا ہے، دعا کیجئے کہ صحت و عافیت کے ساتھ حج کے ارکان پورے ہوجائیں، حج و زیارت سے واپسی کراچی ہو کر ہوگی،

محمد امان اللہ قادری پھلواروی

۳۰ / ۸ / ۷۹ء

(۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پھلواری شریف
۷ شوال ۱۳۹۹ھ
۳۱ اگست ۱۹۷۹ء

گرامی قدر، محب مکرم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ:-

پرسوں پٹنہ کے اخبار سے اچانک اطلاع ملی کہ جناب مولانا عبد السلام قدوائی اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ خبر ذرا دیر سے ملی، مگر بڑی صبر آزما اور دلدوز ثابت ہوئی، عزیزی مولوی نصر احمد سلمہٗ ۳ رمضان مبارک کو اعظم گڈھ سے پھلواری آئے تو اُن سے آپ دونوں کی خیریت اور حالات میں نے خاص طور سے دریافت کی، اور اُن کے بتانے پر اطمینان

ہوگیا، پھر ان کو دارالمصنفین کے کسی خط سے خبر ملی کہ مولانا رمضان کے آخر عشرہ میں مکان گئے، اب یہ رحلت کی اطلاع صاعقہ بن کر آئی تفصیل کا کچھ علم نہ ہوسکا کہ علالت کیا ہوئی!

بہرحال مشیت الٰہی یہی تھی اور رمضان مبارک کی رحمت و مغفرت اور رستگاری جہنم سے نوازنے کے لئے اُن کو رمضان مبارک کے آخری دن جمعہ کے روز بلالیا گیا، اور وہ رحمت و مغفرت کی چادروں میں ڈھانک لئے گئے، سچ ہے اور کہنے والے نے بالکل سچ کہا ہے،

رحمتِ حق بہا نہ می جوید ‏ ‏ رحمتِ حق بہا نمی جوید

مولانا بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی تھے، اور خاموشی کے ساتھ بہت مستحکم ٹھوس کام کرتے تھے، میری ملاقات اُن سے اُس وقت سے تھی جب وہ دہلی جامعہ ملیہ اور تعلیمات اسلام وغیرہ میں تھے، اور بڑی بے تکلفانہ گفتگو مجھ سے فرماتے تھے، ادھر جب بھی ندوہ یا دارالمصنفین میں ملاقات ہوتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اور محبت و شفقت سے باتیں کرتے، شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور میرے یہاں کے شاہ عزالدین صاحب اور مولانا قدوائی ایک ہی دور کے ندوی تھے، افسوس کہ ان میں سے کوئی نہ رہا،

ع:- افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

یہ حادثہ بڑا قومی و علمی حادثہ ہے اور دارالمصنفین کے لئے نہایت شدید و سنگین سانحہ۔

شاہ صاحب مرحوم کے بعد آپ کی تنہائی دور ہونے کا سامان مولانا کے وجود سے ہوگیا تھا، مگر چند سال کے بعد آپ کے لئے پھر وہی منزل آگئی، یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے، کاش آپ کو کوئی اور معاون مل جائے وما ذٰلک علی اللہ بعزیز،

والسلام

عون احمد

(۸)

یکم ستمبر ۷۹ء

چاند پٹی

برادر مکرم   السّلام علیکم

میں رمضان بعد ہی سے آپ کے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا، اور قدرۃً اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس موقع پر مولانا عبدالسلام صاحب سے بھی ملاقات ہوگی، اور اُن سے ہم کلام ہونے کی مسرت حاصل ہوگی، لیکن کل شام دعوت سے یہ معلوم کرکے کلیجہ دھک سے ہوکر رہ گیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

ابھی جلد ہی رمضان سے قبل اُن سے ملاقات ہوئی تھی، یہ کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد رخصت ہونے والے ہیں، اس موقع پر اُن کی خوبیاں شدت سے یاد آرہی ہیں، مولانا کے اہلِ خانہ غالباً دارالمصنفین ہی میں ہوں گے، بڑی عنایت ہوگی، میری طرف سے تعزیت فرما دیں،

افسوس ہے کہ ہمارے لائق افراد یکے بعد دیگرے اُٹھتے جا رہے ہیں، اور بظاہر اُن کی جگہ لینے والے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُمتِ مسلمہ پر رحم فرمائے،

ندوہ کے لئے تو خاص طور سے ایک سنگین حادثہ ہے، ابھی دو زخم تازہ ہی تھے کہ تیسرے حادثہ سے بھی اسے دو چار ہونا پڑا، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا بیماری تھی، اور کب وطن تشریف لے گئے تھے، طبیعت آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے لیکن آنے میں محض اس بنا پر پس و پیش ہو رہا ہے کہ معلوم نہیں آپ اعظم گڈھ میں ہیں یا تعزیت کے لئے رائے بریلی چلے گئے ہیں،

والسلام

ابو اللیث

(۹)

۲۸/۸/۷۹ء

جامعہ ملیہ، نئی دہلی،

محترمی! السلام علیکم

لیجئے ہمارے اور آپ کے مولانا بھی آپ کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور آپ کے لئے نئی آزمائشیں آکھڑی ہوئیں، یہ آپ کا ذاتی غم تو ہے ہی دارالمصنفین کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، اور چونکہ آپ اور دارالمصنفین ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس لئے یہ دُہرا اور کاری زخم ہے جو آپ کو لگا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور قوت دیں کہ آپ اس غم کو مردانہ وار جھیل لے جائیں۔

آپ میں اور مولانا میں اب ایسا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا کہ ہم لوگ آپ دونوں کی سلامتی صحت کی دعا مانگا کرتے تھے کہ آپ دونوں کے سہارے دارالمصنفین کے کام بخیر وخوبی انجام پاتے رہیں گے اور اس کا علمی وتہذیبی معیار باقی رہے گا، اب آپ پھر ایک بار تنہا رہ گئے، کاش کوئی مرد کار غیب سے پھر آجائے اور کسی حد تک یہ خلا پر ہو جائے، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کی صحت بھی ساتھ دے، ورنہ کیا ہوگا؟ اس تصور ہی سے طبیعت متفکر ہو جاتی ہے۔

مولانا علی میاں صاحب کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، محمد الحسنی مرحوم اور اسحٰق جلیس مرحوم کا غم ہی کیا کم تھا کہ تیسرا چرکا ان کو لگا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم لوگوں پر قائم رہے۔

دارالمصنفین کے دوسرے تمام رفقاء اور کارکنوں سے سلام کہئے اور میری طرف سے

تعزیت بھی کر دیجئے، اہل جامعہ بھی مولانا مرحوم کی وفات سے بہت متاثر ہیں، آپ
واقف ہیں کہ انھیں جامعہ اور اہل جامعہ سے کتنا گہرا تعلق تھا۔
خدا کرے آپ کی طبیعت ٹھیک ہو، پچھلے دنوں تو آپ بھی علیل تھے، اب کیسے ہیں؟
تمام پرسانِ حال کو سلام عرض ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

(۱۰)

بسم اللہ

دہلی   ۲۸ راگست ۱۹۷۹ء

مکرمی صباح الدین صاحب! السلام علیکم

میں پریس کمیشن کے کام کے سلسلے میں رمضان المبارک کی ۳۰ کو یہاں آیا،
اور اسی دن شام کو جامعہ نگر گیا، افطار کے وقت وہیں یہ افسوسناک خبر ملی کہ آپکے
رفیق مولانا عبدالسلام صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ دوسرے دن صبح نماز عید کیلئے
جامعہ کی مسجد میں گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ رمضان کی آخری تاریخ کو ان کا اپنے گاؤں میں
انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، امام صاحب نے نماز عید سے قبل یہ خبر نمازیوں کو
سنائی اور مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔

مرحوم عبدالسلام قدوائی صاحب سے مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا، ان پر ندوہ
اور جامعہ دونوں کی چھاپ تھی، صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے اور اس دور میں جن
علماء کو ہم واقعی روشن خیال کہہ سکتے ہیں ان میں مرحوم کا بھی شمار ہوتا ہے، آپکے
رفیق کار تھے اور دارالمصنفین کے کاموں میں آپ کے ساتھ تھے، ان کی پُردرد تعزیت

اور ان کے چہرے کی مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے، رمضان المبارک میں موت بھی
خوش نصیبوں ہی کا حصہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، ان کے پس ماندگان
کو اور آپ جیسے ان کے رفقائے کار کو صبر جمیل عطا کرے۔

آپ کا مخلص   معین الدین حارث

(صدر انجمن اسلام بمبئی، چیرمین حج کمیٹی)

(۱۱)

۱/۹/۷۹ء   لال محل

سیدوالاتبار زادالطافہٗ! سلام مسنون

رات کو ایک کرم فرما آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ اخبار الجمعیۃ میں مولانا عبدالسلام
صاحب قدوائی کی وفات کی اطلاع شائع ہوئی ہے، اس اطلاع سے صدمہ ہوا، اللہ پاک
مغفرت فرمائیں، وہ میرے بھی دیرینہ کرم فرما تھے، نہایت منکسر المزاج اور صاحبِ کمال تھے،
آپ کے دوست اور مددگار تھے، ان کی دائمی جدائی سے آپ کو بھی صدمہ ہوگا، اللہ پاک
صبر کی توفیق عنایت فرمائیں اور اجرِ عظیم بھی عنایت فرمائیں، جو صاحب کمال اٹھ جاتا ہے،
اس کی جگہ خالی رہتی ہے، نعم البدل کم ہی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اللہ پاک مرحوم کو سایۂ رحمت
میں مقام عنایت فرمائیں اور حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کے مراتب بلند فرمائیں،
آمین ثم آمین۔

نیازمند

اخلاق حسین دہلوی

لال محل۔ بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

(۱۲)

باسمہٖ تعالیٰ

قاضی منزل، قاضی اسٹریٹ۔ میرٹھ

مخلص محترم! مدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج سامی بخیر۔

پرسوں کے "الجمعیۃ" سے محب مکرم مولانا عبدالسلام قدوائی کے یکایک انتقال کا حال معلوم ہوا۔ بے حد رنج و افسوس ہوا، افسوس ہے کہ علم وفضل کی ایک اور شمعِ فروزاں گل ہوئی، اور ندوۃ العلماء کا ایک اور ستون گر گیا۔

میرا مرحوم کے ساتھ سترہ ۱۷ سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رفاقت کا تعلق رہا، کبھی ان کی طرف سے کوئی بات ناگواری خاطر کی پیش نہیں آئی، محبت و اخلاص کا پیکر، اور رواداری واعتدال فکر ونظر کا مجسمہ تھے، انہی اوصاف ومحاسن کی وجہ سے جامعہ میں ان کے احباب اور نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں جگہ سہارا دیا اور اپنے بزرگوں کی جانشینی کا حق ادا کیا، دارالمصنفین میں ان کے نہ ہونے سے سارا بوجھ آپ پر آپڑا ہے، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور احباب واعزہ کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

آپ اور دیگر ارکانِ دارالمصنفین میری طرف سے دلی تعزیت قبول فرمائیں، والسلام

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صدر مرکزی دینی تعلیمی بورڈ۔ دہلی

(۱۳)

دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

۵ر شوال ۱۳۹۹ھ

مکرم ومحترم! سلام مسنون

چند دن ہوئے میں نے اپنی ایک ضرورت سے خط لکھا ہے، کل کے اخبارات میں محترم مولانا عبدالسلام قدوائی کے انتقال کی خبر ملی، موصوف اپنے علم وفضل کی پختگی اور اعتدال فکر کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے، اور کچھ شک نہیں کہ دارالمصنفین کے علمی وقار کے باقی رکھنے میں آپ کے مددگار تھے، انتقال کے لئے بڑا اچھا وقت پایا، یہ ان کے اعمال حسنہ کی مقبولیت کی ایک علامت ہے کہ رمضان کے ماہ رحمت نے انھیں اپنی آغوش میں لیا، میں اہل علم حضرات کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتا ہوں، حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور آپ سب حضرات کو صبر جمیل اور ان کا نعم البدل عنایت ہو۔

براہ کرم فرصت ملنے پر میرے پہلے خط کا جواب عنایت فرمائیں۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر

(۱۴)

جامعہ ملیہ، نئی دہلی

۲۴ر اگست ۱۹۷۹ء بوقت ۱۰½ بجے شب

محترمی! السلام علیکم

آج ۱۱ بجے کے قریب اطلاع ملی کہ مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی سخت علیل ہیں، اپنے تمام متعلقین کو فوراً بلایا ہے، ان کے ایک صاحبزادے دفتر میں تھے،

ان کو فوراً اطلاع کی گئی اور سب لوگ ایک بجے تک اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگئے کہ جو ٹرین بھی مل جائے گی اس سے چلے جائیں گے، ابھی رات کے ساڑھے دس بجے ان کے عزیزوں سے یہ معلوم کرنے گیا کہ کون کون لوگ گئے ہیں اور کس ٹرین سے گئے ہیں، نیز یہ کہ لکھنؤ سے کوئی اور اطلاع تو نہیں آئی ہے، تو معلوم ہوا کہ مولانا کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگرچہ مولانا کی عمر کافی تھی، دل کے مریض بھی رہ چکے ہیں، کچھ نہ کچھ بیماری لگی ہی رہتی تھی، مگر پھر بھی اس منحوس اطلاع کے لئے دل تیار نہیں تھا، سخت دھچکا لگا۔

مولانا جہاں بھی رہے، ندوہ، جامعہ اور بالآخر دارالمصنفین میں، ہر جگہ انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ ان کی نیکی، ان کی شرافت، ان کی سادگی، ان کا علم و فضل، ایک ایک کر کے سبھی چیزیں یاد آتی ہیں، جامعہ میں ان کے جمعہ کے خطبے لوگوں کو بہت پسند تھے، لوگوں کو انتظار رہتا تھا کہ مولانا آئیں تو ان کے خطبے سننے کو ملیں۔ وہ بہت تکلف کرتے، فرماتے کہ یہ مستقل امام کا حق ہے، ان ہی کو نماز پڑھانی چاہئے اور خطبہ دینا چاہئے، مگر جب خود امام صاحب اصرار کرتے تو وہ مجبور ہو جاتے، افسوس کہ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے فاضل اور دارالمصنفین کے رفیق سے ہم لوگ محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی نیک صفات اور مخلصانہ خدمات کے عوض میں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

نیاز مند: عبداللطیف اعظمی

(۱۵)

انصاری لاج۔ لال ڈگی۔ علی گڑھ ۲۶/۸/۱۹۷۹ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

اخبار سے مولانا عبدالسلام قدوائی صاحب کے ناگہانی انتقال پُر ملال کا حال معلوم ہو کر

دلی رنج و افسوس ہوا، اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو توفیق صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

اس واقعہ کا آنجناب پر جو اثر ہوا ہوگا اور مرحوم کے انتقال سے دارالمصنفین میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اس کا بخوبی اندازہ ہے مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارہ کار ہی کیا ہے، اس لئے خود صبر و ضبط سے کام لے کر دوسرے رفقاء کو بھی تلقین صبر کیجئے، یقیناً مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے اور آپ کو ان کی وجہ سے جو تقویت و سہارا تھا اس کا بھی نعم البدل دشوار ہے، ازراہ کرم جملہ رفقائے دارالمصنفین کو میرے کلمات تعزیت پہونچا کر تلقین صبر فرما دیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ پاک مرحوم کی تربت کو نور سے معمور فرما کر انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، میں بھی آج اپنے ایک شفیق استاد کی پدرانہ محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

غمگین و شریک غم

اقبال انصاری

(۱۶)

۶ ستمبر ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔ جامعہ ملیہ دہلی

محترم صباح الدین عبدالرحمن صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بیحد صدمہ اور رنج ہوا، مولانا سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۷۲ء میں ہوئی، جب میں نے لائبریری میں ملازمت حاصل کی،

جس لطف و مروت اور خوش خلقی سے مولانا مرحوم نے مجھ سے گفتگو کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی، اس کے بعد جبتک مولانا یہاں رہے اکثر و بیشتر ملاقات کے مواقع ملتے رہے، ان کے جیسا عالم باعمل کم ہوتا ہے، مرحوم مجھ پر بے حد کرم فرماتے تھے۔

ادارۂ دارالمصنفین کے لئے اور آپ کے لئے یہ حادثہ سخت ہے، گو میری یہ بساط نہیں کہ آپ کو صبر کی تلقین کروں، میں خدا سے ملتجی ہوں کہ وہ آپ لوگوں کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی قوت دے۔ فقط والسلام

مخلص، شہاب الدین انصاری

لائبریرین

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

(۱۷)

بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۶ر اگست ۱۹۷۹ء

برادرم صباح الدین صاحب! السلام علیکم

مولانا عبد السلام قدوائی کی وفات کی اچانک خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا، خداوند تعالےٰ ان کی یقیناً مغفرت فرمائے گا، اس درجہ نیک، مخلص اور صالح دل و دماغ کا مالک انسان مشکل ہی سے مل سکے گا، ایسے ہی عالم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے، افسوس ہے کہ دارالمصنفین کو ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع زیادہ مدت نہ مل سکا۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ فقط

مخلص: عتیق صدیقی

(۱۸)

اکبر پور۔ فیض آباد ۲۲۴۱۲۲ ۳۰ر اگست ۷۹ء

محترم و مخدوم دامت معالیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

پرسوں دانش محل لکھنؤ میں اتفاقیہ یہ خبر ملی کہ مولانا عبد السلام صاحب قدوائی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، یہ بھی پتہ چلا کہ یہ سفر آخرت مرحوم کو بڑی مختصر علالت کے بعد اچانک ہی پیش آیا، خداوند عالم حسن مغفرت سے نوازے۔ ایسے رفیق کی جدائی سے جو قلبی صدمہ آپ کو ہوگا اس کا پورا احساس ہے، امید ہے کہ مشیت صبر و شکیب ارزانی کرے گی، میرے قیام شبلی منزل کے وقت مرحوم نے جس التفات کا اظہار کیا تھا، اس کی لذت آج تک تازہ ہے اس لئے مجھے بھی صدمہ ہے۔

راقم: سبط محمد نقوی

(۱۹)

بمبئی یکم ستمبر ۱۹۷۹ء

محترمی! السلام علیکم

ان شاء اللہ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ مولانا عبد السلام قدوائی صاحب کے ناگہانی انتقال کی خبر سن کر سخت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے اور اقربا و احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اس اطلاع سے بیشتر آپ کا ایک خط بھی ملا ہے، ابا جان (منشی عبد العزیز انصاری) اندور بغرض شرکت شادی تشریف لے گئے ہیں اور ان شاء اللہ پرسوں مورخہ ۳ کو واپسی کا ارادہ ہے اسی وقت ان شاء اللہ وہ مطلع ہوں گے، آپ کو ایک مفصل خط تحریر کروا چکے ہیں امید کہ ملا ہوگا۔ والسلام۔

احقر: ابو صالح

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی صاحب علی گڑھ

بہ جرمِ شوق ہیں ہم کوئے یار سے گذرے
نسیم جیسے دیارِ بہار سے گذرے

حیات و موت کا باریک فرق جان گئے
جو لوگ مرحلۂ انتظار سے گذرے

عجیب شرط یہ پایا صبا نے اذنِ خرام
گلوں تک آئے مگر نوکِ خار سے گذرے

نظر اٹھی تھی کہ نشتر سے چبھ گئے دل میں
مگر یہ کیسے کہیں ایسے پیار سے گذرے

وہ ذوقِ راہ نوردی دیا جنوں نے ہمیں
کہ ہم حدِ خلشِ اعتبار سے گذرے

سکونِ بے خبری کاش ایک دن ہوتا
دیارِ زلزلہ و انتشار سے گذرے

رہِ وفا کی فضا میں نہ جانے کیا دیکھا
کہ وہ بھی آئے تو کچھ اشکبار سے گذرے

ہوائے دورِ جوانی ذرا تھمے تو کہوں
کہ اب دریچۂ لیل و نہار سے گذرے

نہ جانے کانٹوں کے ہونٹوں پہ ہو لہو کس کا
رواں دواں تو ہمیں رہ زار خار سے گذرے

خزاں تو کیا انھیں اب زخم یا بھی یاد نہیں
وہ قافلے جو جوارِ بہار سے گذرے

دلوں تک آئے ہیں یادوں کے کارواں لیکن
دلوں کو چھوتے ہوئے نوکِ خار سے گذرے

جنونِ شوق نے کیا کہہ دیا کہ اہلِ نظر
فضائے پیرہنِ تار تار سے گذرے

عطائے جام کا شکریہ ہے، مگر ساقی
وہی تو لے کے جو بیقرار سے گذرے

سکھا گیے مجھے زیدی رموزِ بے باکی
جو حوصلے رہِ زندان و دار سے گذر کر

مطبوعاتِ جدیدہ

تجلیاتِ ربانی جلد اول و دوم مرتبہ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی تقطیع کلاں، کاغذ کتابت طباعت عمدہ مجلد مع گرد پوش صفحات جلد اوّل ۲۵۲ جلد دوم ۱۹۲ قیمت اول تیرہ روپے پچاس پیسے دوم گیارہ روپے پچاس پیسے

ناشر۔ کتب خانہ الفرقان ۳۱، نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات تصوف کی اہم اور مقبول کتابوں میں ہیں، ان کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ان کے اردو ترجمے کے کئی اڈیشن چھپے ہیں، لیکن وہ دین و شریعت کے اہم حقائق اور تصوف و احسان کے دقیق مسائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے تصوف کے علاوہ مجدد صاحب کے دور اور اکبری و جہانگیری عہد کے واقعات سے واقفیت بھی ضروری ہے، اس لیے مکتوبات کی دقیق بحثوں کو نظر انداز کر کے سادہ اور آسان مباحث کی تلخیص اور اس کا سلیس و عام فہم اردو ترجمہ شائع کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ عام لوگ بھی دین و معرفت کے اس گنج گرانمایہ سے مستفید ہو سکیں، اس غرض سے پہلے بھی مکتوبات کے بعض خلاصے مرتب کیے گئے تھے، زیر نظر ترجمہ و تلخیص مولانا نسیم احمد فریدی نے اس عہد کے مذاق کے مطابق بہت شوق اور بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے، وہ بادۂ عرفاں کے لذت شناس بزرگانِ دین کے عقیدت مند اور حضرت مجدد صاحبؒ کے پرستار ہیں، ان کے قلم سے مجدد صاحب کے علاوہ دوسرے

کئی بزرگوں کے ملفوظات ومکتوبات کی تلخیص وترجمہ بھی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں برابر شایع ہوتے رہے ہیں، اب انھوں نے مجدد صاحب کے مکتوبات کی تلخیص مع اردو ترجمہ کتابی صورت میں دو جلدوں میں شائع کی ہے، مکتوبات تین دفتروں پر مشتمل ہیں، پہلی جلد میں دفتر اول کے اور دوسری میں دوم وسوم کے مکتوبات کا ترجمہ وتلخیص درج ہے، اکثر مکتوب الیہم کے مختصر اور ضروری حالات بھی حاشیے میں دیدیئے ہیں اور شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے اس میں مجدد صاحبؒ کے مختصر سوانح، مکتوبات کی عظمت واہمیت اور ان کے بارہ میں اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس ضمن میں زمانۂ حال کے ایک مصنف اطہر عباس صاحب کی ہرزہ سرائی کا خاص طور پر ذکر ہے، ان کی انگریزی کتاب جس زمانہ میں شایع ہوئی تھی اسی زمانہ میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب اڈیٹر معارف اور جناب شبیر احمد خان صاحب غوری نے معارف میں اس کا مفصل ومدلل جواب لکھا تھا، مقدمہ نگار نے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے جواب کا خلاصہ تحریر کرکے مجدد صاحب کے بارہ میں اطہر عباس کے رکیک اعتراضات کی حقیقت پوری طرح ظاہر کردی ہے، مجدد صاحبؒ کے مکتوبات کی اس تلخیص میں توحید خالص، اقامت دین، اتباع شریعت، احیائے سنت اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت اور تحریف دین اور بدعات سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے، اس لیے ان کے اندر مسلمانوں کی رہنمائی کا بڑا سامان ہے، اور ان سے حضرت مجدد صاحبؒ کی ایمانی حمیت، دینی غیرت اور مجاہدانہ کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

وفیاتِ ماجدی یا نثری مرثیے۔ مرتبہ حکیم مولوی عبد القوی صاحب دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۱۵ روپے پتہ۔ مولانا عبد الماجد دریابادی اکاڈمی، ہیڈ آفس ۱۵ کچہری روڈ لکھنؤ۔

یہ مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کی ماتمی تحریروں کا انتخاب ہے، جو پہلے ان کے اخبار سچ، صدق اور صدق جدید میں شایع ہوئی تھیں، اس میں علم وفضل، سیاست وصحافت طب وحکمت وغیرہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۶۲ اشخاص پر تعزیتی مضامین وشذرے درج ہیں، شروع میں مولانا نے اپنی ماں، بھائی، بہن، بیوی اور چند دوسرے اعزہ کا ماتم کیا ہے، پھر علماء وفضلا پر تعزیتی مقالے ہیں اس حصہ کے اہم نام یہ ہیں :۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبد الماجد بدایونی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الرحمٰن نگرامی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور افضل العلماً ڈاکٹر عبد الحق کرنولی، تیسرا حصہ لیڈروں کے ماتم پر مشتمل ہے، اس میں گاندھی جی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، جواہر لال نہرو، راجہ صاحب محمود آباد، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد خان شروانی، عبد المجید خواجہ، بہادر یار جنگ، شعیب قریشی، ڈاکٹر ذاکر حسین، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر سمپورنانند اور سر سکندر حیات کے متعلق تاثرات ہیں، چوتھا حصہ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے لیے اور پانچواں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لیے مخصوص ہے، کتاب کے آخری حصہ میں متفرق اشخاص کا ماتم کیا گیا ہے، جن میں سید صدیق حسن اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں، گو اکثر مضامین مختصر اور بعض محض چند سطری ہیں، لیکن ان میں مولانا کے سحر طراز قلم نے مرحومین کی سیرت وشخصیت اور کمالات وخصوصیات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے، ہر مضمون مولانا کے ادب وانشا کی خصوصیات سے معمور ہے، اس میں زبان وبیان کا لطف محاوروں کا برمحل استعمال، لطافت وظرافت اور ادبی صنائع وبدائع

پوری طرح موجود ہیں، مگر کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔

اقبال کے ممدوح علماء: مرتبہ جناب قاضی افضل حق قرشی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۴۴ مجلد، قیمت ۱۵ روپیہ پتہ: مکتبہ محمودیہ، کریم پارک راوی روڈ، لاہور۔

اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے ممدوح و محبوب علما کا ذکر ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ لائق مرتب اور دوسرے اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کے ان کے معاصرین سے مخلصانہ تعلقات دکھائے گئے ہیں، شروع کے مضمون میں ان کے استاد مولانا سید میر حسن سے ان کی عقیدت و محبت کا ذکر ہے، دوسرے مضامین میں مولانا انور شاہ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے اقبال کے روابط و تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق موجودہ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا مضمون بہت سیر حاصل ہے، یہ چٹان کے اقبال نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، اور بعد میں معارف میں بھی چھپا تھا، اس حصہ میں ایک غیر متعلق مضمون بھی ہے، لیکن وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، اس میں ڈاکٹر صاحب کے ان اشعار و خیالات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جن سے انھوں نے رجوع کر لیا تھا یا رجوع کرنے کے باوجود فتنہ و انتشار کے خوف سے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا تھا، جیسے مثنوی اسرار خودی کے حافظ سے متعلق اشعار، دوسرے حصہ میں قدیم و جدید اکابر علما کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے تعریف و تحسین پر مشتمل اقوال و تاثرات درج ہیں، اس میں سابق الذکر معاصرین کے علاوہ حسب ذیل حضرات کے نام قابل ذکر ہیں، علامہ ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، مولانا شاہ اسماعیل شہید، جمال الدین افغانی، مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی، شاہ سلیمان پھلواروی وغیرہ اس حصہ میں مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا محمود الحسن اور مولانا اشرف علی کی نسبت ڈاکٹر صاحب کے جو اقوال درج ہیں وہ بے محل ہیں اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں ان حضرات کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی، دیباچہ میں

اقبال کے مکفرین کا ذکر ہے اس میں بریلوی مسلک کے علما کا تلخ لہجہ میں ذکر ہے، ان حضرات کی شکایت لاحاصل ہے۔

آذری: ترجمہ جناب کبیر احمد صاحب جائسی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۰۴، مجلد، قیمت ۱۲/- روپیہ پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی

یہ کتاب آذر بائیجان کی قدیم زبان آذری کے متعلق معلومات کا مجموعہ ہے، اس کے مصنف احمد کسروی ایران کے مشہور اہل قلم ہیں، انھوں نے پہلے آذر بائیجان کی مختصر تاریخ، وہاں کے قدیم باشندوں اور ان کی بولیوں کا حال بیان کر کے دکھایا ہے کہ یہ کبھی ترکی کے زیر اثر نہیں رہا بلکہ ہمیشہ ایران کا صوبہ رہا، مصنف نے آذر بائیجان کے دریاؤں، پہاڑوں اور شہروں کی تفصیل بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ عربوں کے حملہ کے وقت یہاں کی زبان آذری تھی، پھر سلجوقیوں، منگولوں، تیموریوں اور صفویوں کے ایران پر قبضہ و تسلط کا ذکر کر کے آذر بائیجان کی عام بول چال ترکی ہونے کے اسباب بتائے ہیں، اس ضمن میں زبانوں کے وجود میں آنے کے بعض وجوہ پر بھی بحث کی ہے، آخر میں آذری کا جو قدیم سرمایہ محفوظ رہ گیا ہے اس کے اور موجودہ زمانہ کی آذری کے نمونے دے کر اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، اس طرح کی خشک کتاب کا ترجمہ مشکل ہوتا ہے، مگر کبیر احمد جائسی صاحب نے اس کا سلیس و رواں اردو ترجمہ کر کے اپنے کامیاب مترجم ہونے کا ثبوت دیا ہے، ابتدا میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں کتاب کے مندرجات کی وضاحت کی گئی ہے، امید کہ علمی حلقہ میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

دعائے صباح: مرتبہ جناب کالی داس گپتا رضا، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۸۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے
پتہ:- ناشرون پبلیکیشنز، ۱۰۷، اجولی بھون نبرا نیو مرین لائن
چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

مسلمانوں کے فرقہ شیعہ میں دعائے صباح کو بڑی اہمیت ومقبولیت حاصل ہے، یہ حضرت علیؓ سے منسوب ایک مشہور دعا ہے، مرزا غالب مرحوم نے اس کا منظوم فارسی ترجمہ کیا تھا جو ان کی زندگی میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایماء سے نول کشور نے پہلی دفعہ شائع کیا تھا، یہ اڈیشن اب نادر و کمیاب تھا، مگر حسن اتفاق سے غالب کے پرستار اور اردو کے معروف ادیب و شاعر جناب کالی داس گپتا رضا کے کتب خانہ کے غالب کلکشن میں پایا گیا، اسی کو انھوں نے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس اڈیشن میں غالب کے منظوم فارسی ترجمہ کے ساتھ دعائے صباح کا عربی متن اور فارسی میں ایک نثری ترجمہ بھی شامل تھا، یہ سب من وعن زیر تبصرہ کتاب میں بھی آگئے ہیں، مقدمہ میں دعائے صباح کی اہمیت، غالب کے منظوم ترجمہ کی مختلف اشاعتوں اور اس کے متعلق دوسری ضروری باتوں کے علاوہ اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، جو گپتا صاحب کے خیال میں غالب کے عہد جوانی سے پہلے کی تصنیف ہونے کا نتیجہ ہیں، ان کے خیال میں فارسی کا نثری ترجمہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ہے، مگر انھوں نے اس پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی ہے۔ "ض"

جلد ۱۲۴ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات